غالب نامہ
مومن نمبر

غالب نامہ

مجلسِ مشاورت

پروفیسر مسعود حسین خاں
پروفیسر سید امیر حسن عابدی
پروفیسر مختار الدین احمد

اُردو میں علمی ادبی اور تحقیقی رفتار کا آئینہ

مدیر اعلا:
پروفیسر نذیر احمد

مدیران:
رشید حسن خاں
ڈاکٹر نورالحسن انصاری
شاہد ماہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ
ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مجلّہ غالب نامہ نئی دہلی

جولائی ۱۹۸۵ء

جلد ۷ ـــــــــــــــــــــــ شمارہ ۲

قیمت : ۳۰ روپے

ناشر و طابع : شاہد ماہلی

کتابت : ریاض دہلوی

مطبوعہ چمن آفسٹ پرنٹرس، دہلی

خط و کتابت کا پتا

غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون : ـــــــــ ۳۳۱۶۵۱۸

فہرست

اداریہ

غالب نامے کا نیا شمارہ مومن نمبر آپ کے سامنے ہے۔ فروری ۱۹۸۵ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے بین الاقوامی سمینار منعقد ہوا تھا اس میں ہندوستان اور بیرون ہند کے کافی دانش ور شریک ہوئے تھے۔ سمینار کے بیشتر مقالے غالب نامے کے حالیہ شمارے میں شامل ہیں۔ ان میں مومن کی جمالیات سے متعلق ایک مقالہ ہے مقالہ نگار پروفیسر شکیل الرحمن ان دنوں ہندوستان سے باہر تھے اس لیے سمینار میں شریک نہ ہو سکے اور اپنا مقالہ نہ پیش کر سکے۔ ایک مقالہ ایرانی محقق محمد حسین تسبیحی ادارۂ تحقیق ایران و پاکستان کا تھا۔ تسبیحی صاحب کو سمینار میں شرکت کی دعوت تھی مگر وہ تشریف نہ لا سکے۔ انھوں نے مقالہ بعنوان "اوزان عروضی اشعار مومن" بھیج دیا تھا وقت کی تنگی کی وجہ سے یہ مقالہ شامل نہ ہو سکا۔ غالب نامے کے آئندہ شمارے میں اس کی اشاعت ہو جائے گی۔

مضامین کی فہرست پر نظر ڈالنے سے کسی قدر اندازہ ہو جائے گا۔ اس شمارے میں مومن

کی زندگی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس طرح یہ شمارہ مومن سے متعلق نہایت وقیع مواد کا حامل ہے۔

اس شمارے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نگار کے مومن نمبر سے نیاز فتح پوری کے انتخاب کردہ اشعار لیے گئے ہیں

امید کی جاتی ہے اردو و فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کا استقبال کریں گے۔

نذیر احمد

ڈاکٹر خلیق انجم

مومن کا سوانحی خاکہ

۱۷۶۱ء کے آس پاس، شاہ عالم ثانی کے زمانے میں، دو بھائی کامدار خاں اور نامدار خاں، کشمیر سے دلی آئے۔ پیشے کے اعتبار سے دونوں بھائی طبیب تھے اور اس فن میں مہارت رکھتے تھے۔ دلی میں دونوں بھائی شاہی ملازم ہو گئے۔ پرگنہ نارنول میں انھیں کچھ گاؤں بطور جاگیر ملے۔ مومن کے خطوط میں اس جاگیر کا ذکر کئی بار آیا ہے۔

حکیم نامدار خاں کے ہاں تین لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ سب سے چھوٹے لڑکے حکیم غلام نبی خاں تھے۔ یہی مومن کے والد ہیں۔

حکیم نامدار خاں کا انتقال ہو چکا تھا کہ ۱۸۰۳ء میں پرگنہ نارنول کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے اقتدار میں لے لیا اور حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں کے خاندان کے لیے ریاست جھجر کے خزانے سے ایک ہزار روپے سالانہ کی پنشن مقرر کر دی گئی۔ اس پنشن کی تقسیم خاندان میں اس طرح کی گئی کہ مومن کے والد حکیم غلام نبی خاں کو بیتالیس روپے ماہوار ملنے لگے۔

۱۸۰۰ء میں حکیم غلام نبی خاں کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ چوں کہ حکیم صاحب کو شاہ عبدالعزیز سے بہت عقیدت تھی، اس لیے شاہ صاحب کو زحمت دی گئی۔ انھوں نے اس بچّے کے کان میں اذان دی۔ غرش گیاوی کے بیان کے مطابق گھر والوں نے بچے کا نام حبیب اللہ تجویز کیا لیکن شاہ عبدالعزیز نے "محمد مومن خاں" نام رکھا۔ شاہ صاحب کے

آگے کس کی چل سکتی تھی۔ گھر والوں نے اپنا تجویز کیا ہوا نام مجبوراً واپس لے لیا۔

ممکن ہے کہ حکیم غلام نبی خاں کی کچھ اور اولادیں بھی ہوئی ہوں، جو زندہ نہ رہیں۔ ہمیں صرف دو بچوں کا علم ہے، مومن اور اُن کی چھوٹی بہن ـــ چھوٹی بہن کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔ ہاں، اُن کے بارے میں اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ اس بہن کی ایک لڑکی تھی جس کی شادی میر عبدالرحمٰن آہی سے ہوئی تھی۔ مومن کو آہی سے اتنی محبت تھی کہ انھیں منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا اور تمام زندگی اس رشتے کو نبھایا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ مومن خاں نے کن لوگوں سے تعلیم پائی۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ابتدائی تعلیم مدرسہ شاہ عبدالعزیز میں ہوئی، چوں کہ مومن کے والد کے شاہ عبدالعزیز سے مراسم تھے۔ انھوں نے مومن کے کان میں اذان دی تھی، مدرسہ شاہ عبدالعزیز مومن خاں کے گھر سے بہت قریب تھا۔ اس مدرسے میں تعلیم پانے کے لیے بچے دور دور سے آتے تھے۔ اس لیے امکان ہے کہ مومن نے ابتدائی تعلیم شاہ عبدالعزیز سے اُن کے مدرسے میں حاصل کی ہو۔ عربی کی ابتدائی کتابیں انھوں نے شاہ عبدالقادر سے پڑھیں۔ کہا جاتا ہے کہ مومن نے اپنے عہد کے مشہور عالم عبداللہ خاں علوی سے بھی فارسی پڑھی تھی۔

مومن کا حافظہ بہت تیز تھا۔ شاہ عبدالقادر سے ایک بار جو بات سنتے۔ وہ فوراً یاد ہو جاتی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز کا وعظ ایک دفعہ سن کر لفظ لفظ سنا دیا کرتے تھے۔ قرآن شریف بھی حفظ کرنا شروع کیا تھا۔ ہمیں اس کا علم نہیں کہ قرآن شریف پورا حفظ کر لیا تھا، یا نہیں۔

مومن نے "مثنوی شکایتِ ستم" میں ابتدائی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُن کی عمر نو سال تھی، قرآن شریف حفظ کر رہے تھے کہ پڑوس میں ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ نو سال کے اس نوجوان کے دل پر محبت کا ایسا جادو ہوا کہ سدھ بدھ بھول گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کی طرف توجہ کم ہو گئی۔ ان دونوں کے ملنے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی، اس لیے ممکن ہے کہ لڑکی کے دل و دماغ پر اس کا بہت برا اثر پڑا ہو۔ بہر حال وہ لڑکی بیمار پڑ گئی اور کچھ ہی روز میں خدا کو پیاری ہو گئی۔

مومن پر اس حادثے کا کیا اثر ہوا. خود اُن کی زبانی سُنیے :

مجھ کو جس وقت یہ خبر آئی
بیہشی مرگ کی خبر لائی

پاسِ بدنامی اک ذرا نہ رہا
ہوش ناموس و ننگ کا نہ رہا

دم اٹکتے اٹکتے ٹوٹ گیا
سر پٹکتے پٹکتے پھوٹ گیا

محبوبہ کے انتقال کے صدمے میں مومن بے ہوش پڑے تھے. ایک دن ہوش آیا تو :

دیکھتا کیا ہوں ایک زہرہ جبیں
جلوہ افروز ہے سرِ بالیں

سالِ عمر اب تھے ہم شمارِ بروج
کہ ہوا اخترِ بلا کا عروج

چرخ نے داغِ نو دیا مجھ کو
والہ اس ماہ کا کیا مجھ کو

صدقہ جاں گسل دوبارہ ہوا
جوں کتاں سینہ پارہ پارہ ہوا

دیکھ زانو پہ اُس کے سر اپنا
تھا دماغ آسمان پر اپنا

غرض اس نو وارد حسینہ کو دیکھ کر مومن پہلی محبوبہ کو فراموش کر بیٹھے، جس کی وفات نے ان کی یہ حالت بنائی تھی اور اب اُس حسینہ کے فریفتہ ہو گئے جس نے اپنے زانو پر ان کا سر رکھا ہوا تھا۔

اس طرح کاروبار عشق کی وجہ سے مومن کی باقاعدہ تعلیم ختم ہو گئی۔ تیرہ سال عمر تھی۔ پڑھنے لکھنے میں دل نہیں لگتا تھا گھر والوں نے مجبوراً مطب میں بٹھا دیا۔ یہ مطب مومن کے چچا حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں کا تھا۔ مومن خاں دونوں سے طب کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ بہت جلد اتنی شدبد ہو گئی کہ مطب میں نسخہ نویسی کا کام انھیں سونپ دیا گیا۔ کچھ ہی عرصے میں مومن نے اس میں مہارت حاصل کر لی۔

کئی تذکرہ نگاروں نے فن طب میں مومن کی مہارت کا ذکر کیا ہے۔ سید علی حسن نے بزم سخن (ص ۱۰۷) میں لکھا ہے کہ "علاوہ بریں فن شاعری در طب دستگاہِ وافر داشت" نور الحسن نے طور کلیم (ص ۹۰) میں لکھا ہے "در طب ید طولیٰ داشت" کریم الدین نے گلدستۂ نازنیناں میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے "حکیم اس پائے کا کہ بو علی سینا اگر تمام عمر قانون طبابت کے سیکھنے میں گنوائے پر اِن کے سامنے نبض دیکھنے کا شعور نہ پائے"۔

کئی تذکرہ نگاروں نے نجوم و رمل سے مومن کی واقفیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ محمد حسین آزاد نے فن نجوم میں مومن کی مہارت کا ذکر کرتے ہوئے ان الفاظ میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے

"تیز طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک فن پر دل نہیں جمتا۔ اس نے بزرگوں کے علم یعنی طبابت پر تھمنے نہ دیا۔ دل میں طرح طرح کے شوق پیدا کیے۔ شاعری کے علاوہ نجوم کا خیال آیا۔ اُس کو اہلِ کمال سے حاصل کیا اور مہارت بہم پہنچائی۔ اُن کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ احکام سن سن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے۔ سال بھر میں ایک بار تقویم

دیکھتے تھے، پھر برس دن تک تمام ستاروں کے مقام اور اُن کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی، جب کوئی سوال پیش کرتا، نہ زائچہ کھینچتے نہ تقویم دیکھتے، پوچھنے والے سے کہتے تم خاموش رہو، جو میں کہتا جاؤں، اُس کا جواب دیتے جاؤ۔ پھر مختلف باتیں پوچھتے تھے اور سائل اکثر تسلیم کرتا جاتا تھا۔ ایک دن ایک غریب ہندو نہایت بے قرار اور پریشان آیا۔ اُن کے بیس برس کے رفیق قدیم شیخ عبدالکریم اس وقت موجود تھے۔ خاں صاحب نے اُسے دیکھ کر کہا کہ تمہارا کچھ مال جاتا رہا؟ اُس نے کہا "میں لُٹ گیا" کہا، خاموش رہو، جو میں کہوں اُسے سنتے جاؤ۔ جو بات غلط ہو، اُس کا انکار کر دینا۔ پھر پوچھا "کیا زیور کی قسم سے تھا" صاحب ہاں، وہی عمر بھر کی کمائی تھی۔ یا تم نے لیا ہے یا تمہاری بیوی نے۔ کوئی غیر پرائے نہیں آیا۔

اس نے کہا "میرا مال تھا اور بیوی کے پہننے کا زیور تھا، ہم کیوں چراتے" ہنس کر فرمایا، کہیں رکھ کر بھول گئے ہو گے۔ مال کہیں باہر نہیں گیا۔ اس نے کہا صاحب سارا گھر ڈھونڈ مارا کوئی جگہ باقی نہیں رہی" فرمایا پھر دیکھو۔ گیا اور سارے گھر میں اچھی طرح دیکھا۔ پھر آکر کہا، صاحب میرا چھوٹا سا گھر ہے ایک ایک کونا دیکھ لیا۔ کہیں پتا نہیں لگتا۔ خاں صاحب نے کہا "اسی گھر میں ہے" تم غلط کہتے ہو" کہا آپ چل کر تلاشی لے لیجیے، میں تو ڈھونڈ چکا۔ فرمایا "میں یہیں سے بتاتا ہوں" یہ کہہ کر اس کے گھر کا سارا نقشہ بیان کرنا شروع کیا وہ سب باتوں کو تسلیم کرتا جاتا تھا۔ پھر کہا اس گھر میں جنوب کے رُخ ایک کوٹھری ہے اور اس میں شمال کی جانب ایک لکڑی کا مچان ہے، اُس کے اوپر مال موجود ہے، جاکر لے لو۔ اُس نے کہا "مچان کو تین دفعہ چھان مارا، وہاں نہیں ملا۔ فرمایا اس کے ایک کونے میں پڑا ہے، غرض وہ گیا اور جب روشنی کر کے دیکھا تو ڈبا اور اس میں سارا زیور جوں کا توں وہیں سے مل گیا۔"

فرحت اللہ بیگ نے "دلّی کی آخری شمع" میں ایک اور واقعہ نقل کیا ہے۔ ایک دفعہ مومن کے پاس اُن کے عزیز شاگرد حکیم سکھانند رقم تشریف رکھتے تھے۔ سامنے دیوار پر ایک چھپکلی بیٹھی تھی۔ مومن نے چھپکلی دیکھ کر رقم سے کہا "جب تک پورب کی طرف سے اس چھپکلی کا جوڑا نہ آجائے، یہ دیوار سے نہ جائے گی، اس کا جوڑا آئے پر آئے"۔ بہت دیر ہوگئی، اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں چھپکلی دیوار پر بیٹھی رہی۔ اچانک کپڑوں کا ایک سوداگر آیا۔ کپڑوں کی گٹھڑی مزدور کے سر پر تھی سوداگر نے مزدور کے سر سے گٹھڑی اُتاری، اُس میں سے پٹ سے ایک چھپکلی گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ گئی۔ جو چھپکلی پہلے سے دیوار پر جمی بیٹھی تھی، وہ لپک کر اُس سے آملی اور دونوں مل کر ایک طرف چلے گئے۔ ہمارے پاس ان واقعات کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ ان میں مبالغے سے کام لیا گیا ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مومن کو فنِ نجوم میں خاصی مہارت تھی، اس کا ثبوت وہ مقدمے ہیں، جو انھوں نے ۱۲۴۸ھ، ۱۲۴۹ھ اور ۱۲۵۰ھ کی تقویموں پر لکھے تھے اور جو انشائے مومن میں شامل ہیں۔

مومن کو فنِ عملیات میں بھی دخل تھا۔ عرشؔ گیاوی نے لکھا ہے کہ مومن کی پوتی نے بتایا تھا کہ مومن کے تعویز گنڈے کی دُھوم تھی۔ ایک قصیدے میں مومن نے اپنی تعویز نویسی کا ذکر کیا ہے۔

مومن نے موسیقی کی طرف توجہ کی تو اس فن میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ ضیا احمد بدایونی مرحوم لکھتے ہیں کہ مومن کو موسیقی میں ایسی مہارت حاصل تھی کہ اُن کے انتقال پر مشہور بین نواز میرزا ناصر احمد نے اپنی بین اُٹھا کر رکھ دی، کیوں کہ اُن کا خیال تھا کہ مومن کے بعد اب اُن کے فن کا کوئی قدردان نہیں رہا تھا۔

فنِ موسیقی میں مہارت کی وجہ سے مومن مشاعروں میں ترنم سے غزل پڑھتے تھے۔ محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ "میں نے انھیں نواب اصغر علی خاں اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سنا تھا، ایسی دردناک آواز سے دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا۔

موسیقی کی طرح علم ریاضی اور شطرنج کا بھی بہت شوق تھا اور ان دونوں میں بھی مہارت حاصل کی تھی۔ دلی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں، مومن کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے جن کے ساتھ وہ شطرنج کھیلتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دو شاطر ایسے تھے جن سے وہ مات کھالیتے تھے، ورنہ اس کھیل میں کوئی اُن کے مقابلے کا نہیں تھا۔ ریاضی میں خواجہ محمد نصیر کے علاوہ مومن کسی اور کو اپنے برابر کا نہ سمجھتے تھے۔

فرحت اللہ بیگ نے دلی کی آخری شمع میں مومن کا حلیہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "کشیدہ قامت، سرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھنویں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، اُن پہ پان کا لاکھا جما ہوا، مِسّی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے ڈنڈ، پتلی کمر، چوڑا سینہ اور لمبی لمبی انگلیاں، سر پر گھونگر والے لمبے بال زلفیں بن کر پشت اور شانوں پر بکھرے ہیں۔ کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی ہیں کانوں کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنالیا تھا۔ بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا، لیکن اس کے نیچے کرتا نہ تھا اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں کونے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت پاؤں میں سرخ گلبدن کا پاجامہ، مہریوں پر سے تنگ، اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا۔ کبھی کبھی ایک برکا پاجامہ بھی پہنتے تھے، مگر کسی قسم کا بھی ہو، ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سرخ نیفہ، انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئی، کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی دوپلڑی ٹوپی۔ اس کے کنارے پر باریک لیس، ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آگئی تھی، اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔"

اس حلیے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن بڑے خوبصورت اور بانکے نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب انسان تھے۔

مومن نے دو شادیاں کی تھیں۔ اُن کی پہلی شادی سردھنہ ضلع میرٹھ کے عظیم اللہ بیگ

کمیدان کی صاحبزادی سے ۱۸۲۳ء میں ہوئی۔ اُس وقت مومن کی عمر ۲۳ سال تھی شادی کے کچھ ہی دن بعد میاں بیوی میں ناچاقی ہوئی اور مومن کی بیوی سردھنہ واپس چلی گئیں۔ یہ پتا نہیں چلا کہ طلاق ہوئی یا نہیں۔ ہاں، اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ مومن پھر کبھی اُن سے ملے ہوں۔ مومن کی دوسری شادی خواجہ میر درد کے نواسے خواجہ محمد نصیر کی صاحبزادی انجمن النسا سے ۱۸۲۹ء میں ہوئی۔ پہلی بیوی سے مومن کی غالباً کوئی اولاد نہیں تھی۔ دوسری بیوی سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔

دلّی کی آخری شمع میں فرحت اللہ بیگ نے مومن کے مکان کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں "حکیم آغا جان کے چھتے کے سامنے خاں صاحب کا مکان ہے۔ بڑا دروازہ ہے۔ اندر بہت وسیع صحن اور اس کے چاروں طرف عمارت ہے۔ دو طرف صحنچیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان۔ پہلے دالان کے اوپر کمرہ ہے۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا ہے۔ لیکن منڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے حاشیے میں اس مکان کے بارے میں لکھا ہے کہ میں نے خود یہ مکان بیس بائیس برس ہوئے دیکھا تھا۔ ٹوٹ کر کھنڈر ہو گیا تھا۔ تین طرف کی عمارت ڈھے گئی تھی۔ سامنے کا حصہ قائم تھا۔" اسی مکان کے بارے میں عبدالقادر نے اپنے روزنامچے میں تقریباً ۱۸۲۵ء میں لکھا ہے کہ " در شاعرانِ نوجوان مومن خاں است کہ متصل کوچہ چیلاں نزدیک تر از مکان، معروف بہ کلاں محل خانہ دارد"

کلاں محل سے کوچہ چیلاں کی طرف جاتے ہوئے تھوڑے سے فاصلے پر چھتہ حکیم آغا جان ہے۔ اس کے بالکل سامنے گلی مزار والی اور اس سے پہلے ایک بہت بڑی حویلی ہے۔ تین چار سال کی عمر سے راقم الحروف کلاں محل میں رہتا ہے میں بچپن سے اپنے بزرگوں سے سنتا آیا ہوں کہ مومن خاں مومن کی یہی حویلی ہے۔ شاہد احمد دہلوی صاحب ۱۹۶۰ء یا ۱۹۶۱ء میں دہلی آئے تھے، تو میں نے اُن سے مومن کے مکان کے بارے میں دریافت کیا انھوں نے بھی اسی حویلی کی نشان دہی کی تھی۔

۱۸۲۷ء میں مرزا سنگین بیگ نے سیر المنازل میں کوچہ چیلان اور کلاں محل کے مکانات

کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے" اس کے بعد نامدار خاں اور کامدار خاں کی حویلی اور مسجد ہے۔" میرا خیال ہے کہ مرزا سنگین بیگ اسی حویلی کی بات کر رہے ہیں۔ جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔

اگر میرا یہ خیال درست ہے تو پہلے یہ حویلی بہت بڑی تھی۔ بعد میں اسے کم سے کم دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک حصہ وہ ہے، جو اب گلی مزار والی ہے اور جس میں اب پندرہ بیس مکانات ہیں۔ اور دوسرا حصہ وہ ہے جو بدلی ہوئی شکل میں اب بھی محفوظ ہے۔

بہت سے ایسے شواہد موجود ہیں، جن کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مومن زندگی میں کبھی خوش حال نہیں رہے، وہ متوسط الحال تھے اور کبھی کبھی خاصی مالی دشواریوں کے شکار ہو جاتے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں عبدالقادر خاں نے مومن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی جاگیر ضبط ہو چکی ہے، اور دہلی کے بعض قدیم خاندانوں کی طرح ان کی زندگی بھی عسرت میں بسر ہو رہی ہے انشائے مومن میں ایک ایسا خط بھی شامل ہے جس کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی مومن کی مالی حالت افسوسناک حد تک خراب ہو جاتی تھی۔ مومن نے لکھا ہے:

> "ایک بقال جس سے نان و نمک زرِ سالانہ کے وعدے پر لیا جاتا تھا، اس سے وعدہ پختہ تھا کہ زرِ سالانہ وصول ہونے والا ہے۔ رقم ادا ہو جائے گی، اس کے تقاضے پر میں نے سختی سے ڈانٹا اور گالیاں دیں، وہ بھی لپٹ پڑا اور عزت آبرو پر ہاتھ ڈالا چیخ پکار بلند ہوئی اور بال بھی کھینچا تانی میں آئے۔ لوگ تماشا دیکھنے لگے، یہاں تک کہ چچا صاحب نے میری آواز پہچان لی اور غضب ناک ہو کر انتقام کے لیے باہر نکلے۔ پہلے واقعہ پوچھا جب انھوں نے سنا کہ قرضے کا تقاضا تھا اور وقت گزرنے پر یہ جھگڑا ہوا ہے، اس لیے قصور وار مجھے ٹھہرایا۔"

پریشاں حالی کے باوجود مومن نے کبھی اپنی خودداری پر آنچ نہیں آنے دی۔ اسی لیے انھوں نے اپنی خواہشات اور مادی ضروریات کو محدود رکھا۔ ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے غالباً کبھی اس پر رشک یا حسد نہیں کیا کہ ذوق بادشاہِ وقت کے استاد ہیں انھوں نے انگریزی دربار میں لمبر،

خلعت اور خطابات کی بھی پروا نہیں کی۔ ان کی کج کلاہی نے انھیں کسی اہلِ دول کی مدح سرائی نہیں کرنے دی۔ چنانچہ اُن کے کلام میں صاحبِ ثروت کی مدح میں صرف ایک قصیدہ ملتا ہے۔ یہ قصیدہ کسی امید میں نہیں بلکہ راجا اجیت سنگھ کے شکریے میں ہے جنھوں نے مومن کو تحفے کے طور پر ایک ہتھنی دی تھی۔

مومن کی نازک مزاجی اور خودداری کے دو واقعات سن لیجیے۔ راجا کپورتھلہ نے انھیں ساڑھے تین سو روپے ماہوار پر اپنی ریاست میں بلایا اور سفر خرچ کے طور پر ایک ہزار روپے بھیجے۔ مومن نے یہ پیشکش قبول کرلی، جانے کی تیاری کر رہے تھے، معلوم ہوا کہ راجا کپورتھلہ کے ہاں کسی گانے والے کو بھی وہی تنخواہ ملتی ہے۔ جو مومن کو ملے گی۔ شکریے کے ساتھ سفر خرچ واپس کر دیا۔

مومن شاہی طبیب کے طور پر کسی نواب کے ملازم بھی ہو گئے تھے۔ جناب کلب علی خاں فائق کا خیال ہے کہ نواب فیض محمد خاں والیِ جھجر کے دربار میں ملازم ہوئے تھے۔ انشائے مومن میں ایک خط شامل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن نے کچھ عرصے شاہی طبیب کے فرائض انجام دیے لیکن نواب کی بے رخی دیکھ کر ملازمت چھوڑ دی اور واپس دہلی آ گئے۔

مومن کے بعض خطوط سے پتا چلتا ہے کہ وہ ملازمت کی تلاش میں ترکِ وطن کر کے لکھنؤ یا حیدرآباد جانا چاہتے تھے لیکن قسمت نے یاوری نہیں کی۔

مذہبی عقائد

مومن ابتدائے جوانی ہی سے دین اور دنیا دونوں کا دامن تھامے ہوئے تھے۔ اگر راتیں حسینوں کے کاشانوں کی نذر ہوتی تھیں تو دن شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، سید احمد شہید جیسے بزرگانِ دین کی صحبتوں میں گزرتے۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی نے مومن کے عقائد کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عمل بالحدیث کے قائل اور کتاب و سنت پر عامل رہے۔ عقائد کے معاملے میں خاصے سخت بلکہ کچھ حد تک متعصب تھے۔ مقلدین اور شیعہ حضرات پر اکثر اشعار میں چوٹ کر گئے ہیں۔ مومن کے مولانا فضل حق خیرآبادی سے مراسم تھے، چوں کہ دونوں کے عقائد میں اختلاف تھا۔ اس لیے کبھی کبھی بحث ہو جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ دونوں میں ایک بار مناظرہ ہو گیا تھا۔ مومن

غالب رہے۔ لیکن اس بحث سے طبیعت مکدر ہوگئی اور انھوں نے اس موقع پر یہ شعر کہا :

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

اس شعر میں لطف یہ ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی فرقتی اور آرزو تخلص کرتے تھے۔ کچھ دن بعد جب دونوں میں صلح ہوئی تو مومن نے اپنی ایک غزل کا مطلع پڑھا :

ٹھانی تھی دل میں، اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

مومن کو بزرگانِ دین سے والہانہ محبت تھی ۔جس کا ثبوت اُن کی نعتیں اور منقبت ہیں۔

طبقات شعرائے ہند کے مولف کریم الدین کے مومن سے تعلقات تھے۔ کریم الدین نے لکھا ہے کہ "مجھ پر کمال عنایت فرماتے ہیں۔" کریم الدین نے مومن کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے :

"بہت خلیق اور حلیم .ظریف آدمی ہے۔ ابتدا میں تمام اوقات شعر گوئی اور لہو ولعب میں صرف کر کے تمام مزے عیاشی کے اٹھا کر اب توبہ کی بلکہ شعر بھی کہنا چھوڑ دیا ہے ..... اب پابند نماز و روزے کے بھی بہ نسبت سابق کے بہت ہیں۔" (طبقۂ چہارم ۴۴۳)

کریم الدین کے اس بیان سے کچھ ایسا تاثر قائم ہوتا ہے کہ جوانی میں مومن کی زندگی لہو ولعب میں گزری اور آخری عمر میں تائب ہو کر نماز روزے میں مصروف ہو گئے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کریم الدین نے جب طبقات الشعرائے ہند لکھا ہے، تو مومن کی عمر سینتالیس اڑتالیس سال تھی۔ کہتے ہیں کہ وفات کے وقت، جب مومن کی عمر باون سال تھی اُن کی صحت بہت اچھی تھی، وہ بیمار ہو کر نہیں ایک حادثے میں مرے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ مومن پر مذہبیت کا غلبہ اس لیے نہیں ہوا تھا کہ اُن کا بڑھاپا آ گیا تھا، قویٰ مضمحل ہو گئے تھے اور موت کے خوف سے انھوں نے عزیزو! ب اللہ ہی اللہ ہے کا ورد شروع کر دیا تھا۔ اپنے خاندانی ماحول اور شاہ ولی اللہ کے خاندان سے قربت کی وجہ سے بچپن ہی سے اُن پر مذہب

کا اثر تھا۔ جب سید احمد شہید جہاد کر رہے تھے اور مومن نے اُن کی حمایت میں مثنوی جہادیہ کہی ہے، تو وہ بالکل جوان تھے۔ ہاں عمر کے ساتھ ساتھ دنیا پر دین کو غلبہ حاصل ہوتا گیا۔

مومن کی ۵۲ سال عمر تھی صحت بہت اچھی تھی اُن کے مکان کی مرمت ہو رہی تھی۔ چھت کی کڑیاں دوبارہ ڈالی جا رہی تھیں۔ مومن چھت پر کھڑے مرمت دیکھ رہے تھے چھت کی منڈیر چھوٹی تھی۔ اتفاقاً دھیان بٹا اور پاؤں پھسلا تو چھت سے نیچے آپڑے۔ چھت نیچی تھی، لیکن اتفاق تھا کہ بہت چوٹ آئی اور ہاتھ اور بازو کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ "میخانۂ درد" کے مصنف خواجہ ناصر نذیر فراق اتفاقاً وہاں موجود تھے۔ انھوں نے مومن کو اُٹھا کر نیچے کے کمرے میں لٹایا۔ علاج کیا گیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا مومن نے زائچہ دیکھ کر بتایا کہ پانچ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہیں گے۔ "دست و بازو بہ شکست" سے خود اپنے مرنے کی تاریخ نکالی۔ مئی ۱۸۵۲ء میں آسمانِ شاعری کا روشن اور درخشاں ستارہ ڈوب گیا۔ غالب نے اپنے دوست منشی نبی بخش حقیر کو مومن کی وفات کی خبر ان الفاظ میں دی "سنا ہوگا تم نے کہ مومن خاں مر گئے۔ آج ان کو مرے ہوئے دسواں دن ہے۔ دیکھو بھائی ہمارے بچے مرے جاتے ہیں۔ ہمارے ہم عمر مرے جاتے ہیں۔ قافلہ چلا جاتا ہے۔ اور ہم پا در رکاب بیٹھے ہیں۔ مومن خاں میرا ہم عصر تھا اور یار بھی تھا۔ بیالیس تینتالیس برس ہوئے یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی میری اور اس مرحوم کی عمر تھی کہ مجھ میں اس میں ربط پیدا ہوا۔ اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا۔ حضرت چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا۔ دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے۔ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔"

مومن کی ہدایت تھی کہ انھیں مہندیوں کے اس قبرستان میں مدفون کیا جائے۔ جہاں حضرت شاہ ولی اللہ اور اس خاندان کے دوسرے حضرات کے مزار ہیں۔ اس قبرستان کے احاطے سے باہر شرقی دیوار کے ساتھ انھیں مدفون کیا گیا۔ چوں کہ اس قبرستان میں بزرگانِ دین کے مزار ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ خود مومن نے ان بزرگوں کے احترام میں اپنے وارثوں کو ہدایت دی ہو کہ اُن کی قبر احاطے کے باہر بنائی جائے۔ اس مزار پر کوئی کتبہ نہیں تھا مرزا فرحت اللہ بیگ نے بزرگوں سے تحقیق کر کے مزار کی نشان دہی کی۔ مشہور

ادیب احمد علی صاحب نے مزار کی مرمت کرا کے اس پر کتبہ لگا دیا۔ ۱۹۴۷ء میں جن مزاروں کی لوحیں سنگِ مرمر کی تھیں اُن میں سے بیشتر اکھاڑ لی گئیں۔ ۱۹۶۰ء میں ابوالکلام آزاد اکاڈمی کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم ہوئی۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ اس کے صدر اور میں اس کا سکریٹری مقرر ہوا۔ ڈاکٹر اسلم پرویز، انور کمال حسینی، ڈاکٹر کامل قریشی، گلزار دہلوی صاحب وغیرہ اس کی مجلسِ انتظامیہ میں تھے۔ اس اکاڈمی نے اردو کے کئی مشاہیر کی قبریں تلاش کر کے ان کی مرمت کرائی۔ اس وقت مومن کے مزار کی حالت بہت خستہ تھی۔ کوئی لوحِ مزار اکھاڑ کر لے جا چکا تھا۔ ابوالکلام آزاد اکاڈمی نے مزار کی مرمت کرائی اور اس پر مومن کے نام کا کتبہ لگایا۔

دو تین سال بعد مہندیوں کے قبرستان کے متولی نے مزارِ مومن کی پشت کی دیوار ڈھا کر نئی دیوار اس طرح بنائی کہ مومن کا مزار قبرستان کے احاطے میں آگیا۔ مزار کی دوبارہ مرمت کرائی گئی اور ایک نئی لوحِ مزار نصب کی گئی۔

پروفیسر حکم چند نیر

مومن کی شخصیت کے بعض پہلو

اِس نام کے صدقے، جس کی دولت   مومن رہوں، اور بتوں کو چاہوں

کسی فن کار یا شاعر کی صلاحیتوں اور تخلیقی عوامل کو سمجھنے سمجھانے کے لیے اُس کے حالاتِ زندگی اور اُن کے توسط سے اس کی شخصیت اور سیرت کا مطالعہ اور تجزیہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ حکیم مومن خاں مومن دہلوی کی زندگی کے تفصیلی حالات معلوم نہیں، یہاں تک کہ اُن کی صحیح تاریخ پیدائش اور تاریخِ وفات بھی معلوم نہیں۔ اُن کے سوانح نگاروں نے اُن کے کچھ حالاتِ زندگی مرتب کیے ہیں، لیکن کسی نے اُن کے دروں میں جھانک کر اُن کی شخصیت اور سیرت کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک نقاد نے ہر دو چار صفحات کے بعد قارئین کو غیر ضروری طور پر یاد کرانے کی کوشش کی ہے کہ مومن ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ حالانکہ کسی مورخ یا نقاد نے اُن کی مسلمانی پر شک نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ سوانح نگاروں نے دانستہ طور پر اُن کی شخصیت اور سیرت کا تجزیہ کرنے سے اغماض کیا ہو۔ اُن کے خیال میں اس سے مومن کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہا ہے۔ حالانکہ اُن کے یہ اندیشہ ہائے دور دراز غلط ہیں۔ مرزا غالب نے اپنے خطوں اور دوسری تحریروں میں اپنے حالات اور عیب و ہنر پوست کندہ بیان کیے ہیں۔ ان کے مطالعے سے مرزا غالب کی شخصیت اور سیرت کی نہایت دل کش اور جاذبِ نظر تصویر بنتی ہے اور غالب کی روز افزوں مقبولیت اور شہرت میں اس تصویر کا ہاتھ یقیناً ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان دُنیا کی عجیب ترین مخلوق

ہے وہ نہ تو سراپا فرشتہ ہوتا ہے اور نہ یک سر شیطان۔ بلکہ وہ نیکی و بدی یا خیر و شر کا مجموعہ ہوتا ہے۔ خیر و شر کا یہ امتزاج ہی اُس کی شخصیت میں رنگا رنگی اور دل کشی پیدا کرتا ہے۔ بعض لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے پسندیدہ شاعر یا فن کار کو محض فرشتہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اِس طرح اُسے انسانی جوہر اور خصوصیتوں سے محروم کر کے اُس کی شخصیت کو یک رُخا اور بے رنگ بنا دیتے ہیں۔ اُس کی شخصیت کے تیکھے اور جاذب نقوش کو نہ صرف اُبھرنے نہیں دیتے۔ بلکہ گندکر کے مسخ کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ انسان کا کمال نہ فرشتہ بننے میں ہے اور نہ شیطان بننے میں۔ وہ مکمل اور پورا انسان بھی بنتا ہے۔ جب خیر و شر یا نیکی اور بدی کا مجموعہ ہوتا ہے۔

مومن کے تفصیلی حالاتِ زندگی معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں ان کے اندرون میں جھانکنے اور اُن کی شخصیت و سیرت کو سمجھنے کے لیے ان کی تخلیقات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تحلیلِ نفسی کی مدد سے اُن کی تخلیقات کے داخلی عوامل تک رسائی حاصل کر کے اُن کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ شخصیت اور سیرت کے تضادوں اور گتھیوں کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اُس کی شخصیت کے تیکھے اور جاذب نقوش کو اُجاگر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن شخصیت کے داخلی عوامل تک براہ راست نہیں پہنچا جا سکتا۔ اِس کے لیے اُس کے مظاہر کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اُس کے رہن سہن، لباس پوشاک، ظاہرا اعمال و افعال اور طور طریقوں کو بغور دیکھنا پڑتا ہے۔ شاعر کی تخلیقات بھی اُس کے ایک نوع کے افعال ہوتے ہیں۔

جینیس فن کار کی تخلیقات میں ایک بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ ایک اضطراری کیفیت ملتی ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی شخصیت کے اظہار میں احتیاط سے کام نہیں لیتا۔ اس کے برعکس ایک عام یا معمولی ادیب پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔ وہ عام لوگوں کی طرح خود کو مروجہ اور مقبول سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اِس طرح نقاب اوڑھ کر اپنی انفرادیت کو مجروح کر لیتا ہے۔ جینیس فن کار کو مروجہ معیاروں اور مقبول سانچوں کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ روایات کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ اپنی الگ اور منفرد راہ پہ چلتا ہے۔ بہرحال تحلیلِ نفسی کی مدد سے ہم اُس کے کلام کے تخلیقی عوامل اور شخصیت و سیرت کے ترکیبی عناصر کا پتا لگا سکتے ہیں۔ زندگی اور

فن میں اُس کی کامرانیوں اور ناکامیوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ تحلیلِ نفسی فن کار کی شخصیت اور تخلیقی عوامل پر محدود نوعیت کی روشنی ڈال سکتی ہے۔ اِس سے شاعر کی شخصیت کے نہاں خانوں میں جھانکا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ جلوہ دورکے جلوے سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بہر حال، کچھ نہ جاننے کے مقابلہ تھوڑا سا جاننا بھی غنیمت ہوتا ہے۔

مومن کی تخلیقات میں فارسی خطوط (انشائے مومن) غزلیات، قصائد اور مثنویات ملتی ہیں۔ خطوط سے اُن کے حالاتِ زندگی اور شخصیت پر زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔ کیوں کہ وہ زیادہ تر محمد شاہی طرز میں لکھے گئے ہیں اور عبارت آرائی اور غیر معمولی تصنع سے بھر پور ہیں۔ غزل، اپنی ساخت اور مزاج کے اعتبار سے تفصیلات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ہاں، بعض اشعار سے مومن کے بعض معاملات اور رجحانات پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ تقریباً یہی حال قصائد کا بھی ہے۔ لیکن اُن کی مثنویوں سے اِس ضمن میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ کیوں کہ یہ مثنویاں اُن کی آپ بیتیاں ہیں۔ مومن نے مندرجۂ ذیل بارہ مثنویاں لکھی ہیں:

۱۔ شکایتِ ستم، ۱۲۳۱ھ، ۵۹۲ شعر	۲۔ قصۂ غم، ۱۲۳۵ھ، ۵۲۴ شعر
۳۔ قولِ غمیں، ۱۲۳۶ھ، ۴۴۰ شعر	۴۔ تفِ آتشیں، ۱۲۴۱ھ، ۵۵۳ شعر
۵۔ مثنوی در ماتمِ حکیم غلام نبی خاں زوالدِ مومن) ۱۲۴۱ھ، ۱۱ شعر	۶۔ نکاحِ یارِ جانی کی تاریخ، ۱۲۴۲ھ، ۲۷ شعر
۷۔ حنینِ مغموم، ۱۲۴۴ھ، ۵۹۲ شعر	۸۔ آہ و زاریٔ مظلوم، ۱۲۴۶ھ، ۵۳۰ شعر
۹۔ مناجاتِ عاشقانہ، ۲۰۸ شعر	۱۰۔ مثنویٔ جہادیہ، ۸۴ شعر
۱۱۔ نامۂ مومنِ جاں باز بہ جانب محبوبۂ دل نواز، ۳۹ شعر	۱۲۔ نامہ بہ سوز و گداز بہ سمتِ معشوقۂ طناز، ۴۲ شعر

یہ مثنویاں ۳۰۹۴ شعروں پر مشتمل ہیں۔ دس مثنویاں مومن کی عشقیہ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک مثنوی مذہب سے متعلق ہے اور ایک مثنوی میں مومن نے اپنے والد کی وفات کی تاریخ کہی ہے۔ گویا سبھی مثنویاں اُن کی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔

مومن کی عاشقانہ مثنویوں کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند، اردو مثنوی شمالی ہند میں،

ص ۳۹۹ پر لکھتے ہیں :

"اردو شاعری میں عشق کا تصور عام طور پر بڑا مثالی رہا ہے۔ عاشق اور معشوق دونوں کے کردار کو واقعیت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مثنویوں میں بھی عشق کا معیار غزلوں ہی سے لیا گیا ہے، لیکن بعض مثنویاں ایسی بھی ہیں، جو مبالغہ یا مثالیت سے پاک ہیں۔ اس نوع میں مومن کے کارنامے سرفہرست ہیں۔ اُن کے تجرباتِ عشق سولہ آنے ایسے ہیں جو گوشت پوست کے انسانوں کو پیش آتے رہتے ہیں۔ اردو کے مثنوی نگاروں میں مومن سب سے بڑے حقیقت نگار ہیں۔"

مومن ۱۲۱۴ھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی پہلی مثنوی شکایتِ غم ۱۲۳۱ھ میں لکھی۔ اس وقت اُن کی عمر سولہ سترہ برس تھی۔ اس مثنوی میں انھوں نے اپنے دو عاشقوں کا ذکر کیا ہے اور اپنے بچپن اور لڑکپن کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

تھے برس جم شمارۂ افلاک
کہ ہوا پائمالِ صورتِ خاک

ہائے بچپن میں دل کا آجانا
کچھ سمجھتے نہ تھے یہ کیا جانا

شوق آیا، تو دلِ نیازی کا
کھیل کھیلے تو عشق بازی کا

لذت آئی جو لفظِ الفت سے
پڑھتے دائم الف کے آگے تے

بس کہ تھا دل میں شکوۂ بیداد
سبق الحمد کا نہ رہنا یاد

حفظ قرآن و یادِ مصحف رو
فرصت اِک دم نہ روز و شب میں کبھو

دِن کو وِردِ زباں سبق ناچار
رات بھر درسِ شوق کی تکرار

دیکھیں، آگے دکھائے کیا کیا دن
ہے ابھی سترہ برس کا سِن

مومن کا جس خانوادے سے تعلق تھا۔ وہ تعلیم یافتہ تھا ہم چشموں اور ہم سروں میں عزت رکھتا تھا۔ اُن کے دادا حکیم نامدار خاں چھوٹے موٹے جاگیردار بھی تھے۔ اِس خانوادے کے بھی افراد کو مذہب سے لگاؤ تھا اور وہ شاہ ولی اللہؒ کے اخلاف سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ سرسید نے آثار الصنادید میں حکیم غلام حسن خاں اور حکیم غلام حیدر خاں کا نام لکھا ہے۔ محمد حسین آزاد نے بھی آب حیات میں حکیم غلام حسن خاں، حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام نبی خاں کا ذکر کیا ہے۔ دونوں نے مومن کے اِن بزرگوں کا نام عزت سے لیا ہے۔ طِب میں اُن کی حذاقت کی تعریف کی ہے اور ان کی شہرت وشرافت کی توصیف کی ہے۔ مومن کے مُعاشقے کا عِلم اُن کے والدین کو ہُوا۔ تو اُن کا ردِعمل وہی تھا۔ جو ایک شریف خاندان کا اِس ضمن میں ہونا چاہیے تھا۔ اِس ردِعمل کا حال خود مومن کی زبان سے سنیے:

بدزبانوں نے آکے مُنہ پہ کہا
جا! کہ تو۔ اپنے کام کا نہ رہا

ہم کو بدنام کر دیا تو نے
اے زبوں کار! کیا کیا تو نے؟

کہیں کس مُنہ سے جائیں گے اب ہم؟
ہائے! کیا مُنہ دکھائیں گے اب ہم؟

کیوں نہ آنکھیں لڑاتے آئی حیا؟
تیری آنکھوں سے یہ لحاظ گیا

تجھ سے بے ننگ ونام کو کیا عیب؟
دِل لگا کر ہمیں لگایا عیب

ہم سمجھتے تھے اب تلک معصوم
یہ سیاہ کاریاں نہ تھیں معلوم

ان اشعار کے پس منظر میں اُن اشعار کو پڑھیے ۔ جو مومن نے اپنے مُعاشقے کے بارے میں لکھے ہیں ۔
پہلے بتایا جا چکا ہے کہ جینیس فن کار کی تخلیقات میں بے ساختہ پن اور اضطراری کیفیت پائی جاتی ہے ۔ وہ اپنی شخصیت کے اظہار میں احتیاط سے کام نہیں لیتا مومن نے اپنے خاندان کی عزت اور شہرت کے باوجود اپنے معاشقوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی ۔ بلکہ تمام حالات پوست کندہ بیان کر دیے ہیں ۔ ان مثنویوں میں کہیں کہیں جو عُریانیت در آئی ہے ، وہ حقیقت نگاری کی وجہ سے ہے ۔

جینیس فن کار کی ایک دوسری خصوصیت اُس کی سیمابیت ہوتی ہے ۔ اور اسی سیمابیت کی وجہ سے وہ روایات سے بغاوت کرتا ہے یا روایات کی سختی سے پابند نہیں ہوتا ۔ مومن نے خاندانی روایات سے بغاوت نہ بھی کی ہو ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ انھوں نے کسی روایت کی پابندی استواری سے نہیں کی ۔ انھوں نے روایتی تعلیم مکمل نہ کی ۔ بچپن ہی میں عشق بازی کا کھیل کھیلنے لگے ۔ دن میں حفظِ قرآن کا کام تھا ، تو شب میں مُصحفِ رُخ کی یاد میں مشغول رہتے تھے ۔ ان کی طبیعت کی یہ سیمابیت اس شعر سے بھی ظاہر ہوتی ہے :

ایک نہ ایک سے کام ہی رہوے نام سدا بدنام ہی رہوے

یہ حقیقت بھی ہے مومن نے ۱۲۳۵ھ یعنی ۲۱ برس کی عمر میں مثنوی قصۂ غم میں ایک زن بازاری سے اپنے معاشقے کا تذکرہ کیا ہے ۔ ۱۲۳۶ھ کی تصنیف قولِ غمیں میں صاحب جی سے اپنے معاشقے کے حالات قلم بند کیے ہیں ۔ ۱۲۴۱ھ کی تصنیف تف آتشیں میں ایک نئے معاشقے کے حالات نظم کیے ہیں کسی تقریب میں کسی عزیزہ سے اُن کی آنکھ لڑ گئی تھی ۔ اسی مثنوی میں مومن نے مندرجہ بالا شعر بھی لکھا ہے ۔ ۱۲۴۲ھ میں مومن کی شادی ہو گئی ۔ لیکن اُن کا کاروبارِ عشق جاری رہا ۔ ۱۲۴۶ھ کی تصنیف آہ و زاریِ مظلوم میں انھوں نے ایک نئے معاشقے کا تذکرہ کیا ہے ۔

مومن کی طبیعت کا اضطراب و انتشار اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ کسی ایک چیز کے ہو کر نہ رہ سکتے تھے ۔ اُن کی طبیعت کو یک در گیر و محکم گیر سے لگاؤ نہ تھا جینیس کا دل بہت جلد اچاٹ ہو جاتا ہے ۔ وہ یکسانیت سے گھبراتا ہے اور دوسرے دوسرے اشغال کی طرف مائل ہوتا ہے ۔ مومن اپنی سیمابی طبیعت کی وجہ سے کسی علم و فن کو روایتی انداز میں بالاستیعاب نہ پڑھ سکے اور نہ کسی علم یا فن

کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ چوں کہ جینیس تھے، اس لیے انھوں نے اپنی کوشش و کاوش سے اُردو فارسی عربی، طب، ہیئت، نجوم، شطرنج، موسیقی اور عملیات وغیرہ میں مہارت حاصل کرلی اور نام پیدا کیا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے بیان سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ مومن شطرنج میں اکثر مولانا فضل حق خیرآبادی کو مات دیتے تھے۔ مرزا غالب نے ایک بار مولانا سے اِس کا سبب پوچھا، تو انھوں نے فرمایا: ”مومن بھیڑیا ہے، جسے اپنی قوت کی خبر نہیں۔ اگر وہ عشق و عاشقی کے قضیوں کو چھوڑکر علمی مشغلے میں پڑتا تو اُس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی۔“

ایک عام آدمی جب کسی مہ وش کی زُلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو جاتا ہے، تو وہ بالعموم مصروفِ آہ وفُغاں یا خاموشی سے مشغولِ کاروبارِ عشق رہتا ہے اور اپنی کمزوری پر ہر طرح سے پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک جینیس اپنی کمزوری یا کمزوریوں کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے مرزا غالب نے اپنی شراب نوشی، قمار بازی، رمضان میں روزے کھانے و شطرنج کھیلنے اور ڈومنی کو مار رکھنے کے واقعات پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ مزے لے لے کر فخریہ انداز میں بیان کیا ہے جینیس فن کار خود کو ہیرو بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس سے اُس کی غیر معمولی انا کو تسکین ملتی ہے۔ بالکل یہی حال مومن کا ہے۔ انھوں نے اپنے معاشقوں پر پردہ ڈالنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اپنی مثنویوں میں فخریہ انداز میں اُن کا ڈھنڈورا پیٹا ہے۔ واحد متکلم کے استعمال سے خود کو ہیرو بنا کر پیش کیا ہے اور اپنی انا کو تسکین بہم پہنچائی ہے۔

مومن کی آزاد مزاجی اور شاہد بازی اُن کی سماجی زندگی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ وہ دلی کے ایک کھاتے پیتے اور معزز خاندان کے رُکن اور حکیم غلام نبی خاں کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کی شکل و صورت میں بلا کی جاذبیت تھی کشمیریوں کا گورا چٹا رنگ، پتلے پتلے سُرخ ہونٹ، چوڑی پیشانی، چھریرا بدن، لہراتی اور بل کھاتی سیاہ زلفیں، اُن کی تصویر کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نازک اور خوب صورت جسم میں کچھ برقی لہریں تھیں، جن سے حرکات و سکنات میں اضطراب کی کیفیت پیدا ہوتی رہتی تھی۔ ذہانت، فطانت، شعرگوئی میں قدرت، متعدد فنوں میں شہرت وغیرہ سب کچھ موجود تھا، لیکن ستائیس برس کی عمر تک اُن کی شادی نہ ہو سکی تھی۔ اُس زمانے میں شادی بالعموم بارہ تیرہ برس کی عمر میں ہو جاتی تھی۔ مرزا غالب

کی شادی تیرہ برس کی عمر میں دِلی کے ایک معزز خاندان میں ہوگئی تھی، حالانکہ وہ اس وقت اپنے باپ، چچا اور نانا، تینوں کے سایے سے محروم ہو چکے تھے۔ یتیم تھے، لیکن اپنے معاشرے میں بدنام نہ تھے۔ اِس کے علاوہ مسلمانوں میں شادی بالعموم عزیزوں میں ہوجاتی ہے۔ مومن اپنی آزادروی اور شاہد بازی کی وجہ سے بدنام ہو چکے تھے۔ اُن کے دو معاشقے ایسی لڑکیوں کے ساتھ تھے، جو اُن کے یہاں کسی باہمی عزیز کے یہاں کسی تقریب میں شریک ہوئی تھیں۔ راز فاش ہوجانے پر گھروں اور عزیزوں میں خاصی رسوائی و بدنامی ہوئی ہوگی۔ ان کے والدین نے اگر کہیں سلسلہ جنبانی کی ہوگی، تو اُس کا کہیں سے مثبت جواب نہ ملا ہوگا عزیزوں میں سے بھی کوئی انھیں اپنی فرزندی میں قبول کرنے کو تیار نہ ہوا ہوگا۔ ہم عصر معاشرہ لیے دیے رہنے کا قائل تھا۔ اس زمانے میں طوائف سے تعلق کو معیوب نہ سمجھا جاتا تھا، لیکن طوائفوں کا ہوکر رہ جانا ضرور معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اپنی عزت کے خیال سے طوائفوں سے تعلق کی تشہیر نہیں کی جاتی تھی۔ مومن نے اپنی مثنویوں میں طوائفوں سے اپنے تعلقات اور اپنے معاشقوں کا تذکرہ جس انداز سے کیا ہے، وہ معاصر معاشرے کے لیے قابلِ قبول تھا نہ پسندیدہ۔ اُن کے معاصر تذکرہ نگاروں نے اُن کی رندی و شاہد بازی کو مطعون نہ کیا ہو، لیکن طوائفوں سے اُن کے تعلقات کا ذکر چٹخارے لے لے کر کیا ہے۔

مومن کی شادی کے سلسلے میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۲۴۱ھ میں اُن کے والد کی وفات کے بعد اُن کے شاگرد غلام ضامن کرم نے کوشش کر کے سردھنا ضلع میرٹھ میں عظیم اللہ بیگ کی دُختر کے ساتھ اُن کی شادی طے کرادی۔ اِس شادی کے بارے میں مومن نے اپنے ایک فارسی خط میں جو معلومات فراہم کی ہیں، وہ بڑی عبرت ناک ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ خود دولھا تھے اور خود ہی براتی، اور دولھا میاں کی سواری کے لیے جمنا پار جو باد رفتار موجود تھا۔ وہ بہ قولِ مومن

نہ بے سوار و نہ بے توسن و نہ بے رفتار ۔۔۔ کہ یک دو گام نہ دو سال باتواں رفتن
سوار آں کہ بہ ہر نیم گام می پرسد ۔۔۔ زہمرہش کہ بگو! تا کجا تواں رفتن

یہ باد رفتار، مرزا سودا کے مثالی گھوڑے کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ مزید بریں انھوں نے اپنے خط میں کوردہ سردھنا کی خرابی و ویرانی اور ناکسوں کی صحبت و سلوکِ ناروا کی بھی عبرت ناک تصویر کھینچی ہے۔ ان میں

لاکھ مبالغہ ہو، حقیقتیں بھی جھلکیاں دکھا جاتی ہیں۔ اِن حالات میں مومن جیسے خوش شکل، خوش وضع، خوش پوش، نازک اندام، نازک مزاج شاعر، متعدد علوم وفنون میں ماہر انسان پر کیا گزر گئی ہوگی، سوچ کر انسان لرزہ بر اندام ہو جاتا ہے۔ دلّی کا طرح دار بانکا، جیلا جوان جب کوردہ سرحد میں پہنچا ہوگا تو اُس پر قیامت گزر گئی ہوگی۔

جینیس فن کار یوں بھی بہت حساس ہوتا ہے۔ اُسے عزتِ نفس کا خیال زیادہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی عزت کا تحفظ شیر کی طرح کرتا ہے اور دوسروں پر حملہ کرنے میں یک گونہ خوشی محسوس کرتا ہے۔ دوسروں کے حملے اور ناپسندیدہ چیزوں سے تلملا اٹھتا ہے۔ وہ ہر ناپسندیدہ بات کو اپنی عزت پہ حملہ سمجھتا ہے اور اُسے اپنا وقار مٹی میں ملتا نظر آتا ہے۔ اُسے اپنی برتری کا احساس ہوتا ہے۔ ہمیشہ اپنی بات کی پچ رکھنا چاہتا ہے۔ دوسروں کی تنقید برداشت نہیں کر سکتا۔ ماں باپ کے طعنے مہنے، عزیزوں میں رسوائی، ستائیس برس کی عمر تک شادی نہ ہونے سے ہم عصروں اور ہم سروں میں سبکی کا احساس، مومن کے دل ودماغ کو کچوکے لگاتے ہیں۔ تو ان امور کا ردعمل مومن کے یہاں مثنویِ جہادیہ، جارحانہ مذہبی اشعار اور دوسرے مذاہب و مسالک کے پیروکاروں پر چوٹوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثنویِ جہادیہ اور جارحانہ مذہبی اشعار کا نفسیاتی ماخذ ومنبع یہی احساس اور ردعمل ہے۔ اگر انھیں مذہب سے حقیقی لگاؤ ہوتا تو وہ صرف مثنوی جہادیہ لکھنے پر اکتفا نہ کرتے، بلکہ جہاد میں شریک ہو کر مذہب سے اپنی رغبت اور محبت کا عملی ثبوت دیتے۔ لیکن وہ تو صرف جہادیہ لکھ کر اپنی مذہبیت کا ڈھنڈورا پیٹ کر تسکین حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے اعمال وافعال کے اعتبار سے مومن نہ رہے ہوں، لیکن مثنوی جہادیہ لکھ کر کاغذ پر ضرور مومن بن جاتے ہیں اور شہادت حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کر کے ایصالِ ثواب اور اپنی انا کے لیے تسکین فراہم کرتے ہیں۔

مومن نے مولانا سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ لیکن یہ بیعت بھی محض برائے بیعت تھی۔ اِس نے اُن کی زندگی اور کاروبارِ عشق پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ اُن کے چار معاشقے بیعت کے بعد کے کارنامے ہیں۔ مولانا سید احمد ۱۲۴۶ھ میں معرکۂ جہاد میں شہید ہوئے۔ مومن نے اُس کے بعد بھی مثنوی آہ وزاریِ مظلوم میں اپنے نئے معاشقے کا ذکر کیا ہے۔ ان کے

عزیز ترین شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ و حسرتی نے گلشنِ بے خار میں ۱۲۵۰ھ میں حسینوں سے مومن کی وابستگی کا ذکر کیا ہے۔ نواب وزیر الدولہ والیٔ ٹونک کے ایما سے مدار المہام ریاست نے مومن کو ٹونک آنے کی دعوت دی اور اشارہ کیا کہ زادِ راہِ حج بھی مہیا ہو جائے گا۔ لیکن وہی مومن جس نے پیری کی زندگی میں شوقِ شہادت کا اظہار کیا تھا۔ اور مثنوی جہادیہ لکھ کر دوسروں کو ترغیبِ جہاد دی تھی، اپنی پاک دامانی کی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے اپنی تردامنی کا اظہار کر کے جان بچاتا ہے اور کہتا ہے:

ہے ابھی آرزوئے وصلِ صنم ہے ابھی حسرتِ ہوس رانی

مومن کی غزلوں میں بھی ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں، جن سے مذہب سے اُن کے لگاؤ پر روشنی پڑتی ہے۔ اور کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جن میں انھوں نے دوسرے عقائد و مسالک کے پیروکاروں پر چوٹیں کی ہیں اس ضمن میں ایک اور پہلو بھی مدنظر رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ انھوں نے اپنے تخلص سے بھی بہت فائدہ اٹھایا ہے مومن، ایک ایسا لفظ ہے جو سیکڑوں مذہبی تلازمات و انسلاکات کا حامل ہے مثلاً بُت، بُت خانہ، بُتِ ترسا، بت پرستی، بُت شکنی، بتِ پردہ نشیں، کعبہ، حرم کلیسا، گناہ، ثواب، صنم، ایماں، آفتِ ایماں، دشمنِ ایماں، کفر، کافر، دیں دار، حُور، اِتّقا، اسلام، غارتِ گرِ دیں، جنّت، جہنّم، طواف، صدقہ، خُدا، روزِ جزا، روزِ سزا، ثواب، عذاب، روزِ حساب، بنگ، سجدہ، ایمان بالغیب، حق، پرہیزگار، حلال، اِتہام، خادم بیت الصنم، جبیں سائی، شیخ، حق پرستی، قہر، قہرِ خدا، بادہ، زاہد سالوس، وعظ، واعظ، حُور، حورانِ بہشتی، پیرِ مغاں، صہبا، مزامیر، محتسب، پیمانِ الست، مسجد، محرابِ مسجد، جہانِ خراب، امام، زکوٰۃ، غیرت، ابروئے صنم، روئے صنم، ظلمت کدہ، نماز، روزہ، خانقاہ، عید، رمضان، برکت، بُت خانۂ چیں، جہاد، مجاہد، شہادت، بادہ پرست، سبحہ، رشتۂ زنار، وغیرہ صرف چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں، رعایت لفظی شعر کو چار چاند لگا دیتی ہے مومن نے اپنے نام کے انسلاکات اور تلازمات کو خوب خوب باندھا ہے۔

وہ دن گئے کہ لاف و گزافِ جہاد تھا مومن ہلاکِ خنجرِ نازِ بتاں ہے اب

وصلِ بتاں کے دن تو نہیں یہ کہ ہو وبال — مومن! نماز قصر کریں کیوں سفر میں ہم

پھر دوریٔ بتاں میں نہیں خواب کا خیال — مومن! مرے بھی دین میں سونا حرام ہے

زندہ نہ ہوا ہائے دلِ مُردہ ہمارا — تھا شورِ قیامت سے فزوں ولولہ اپنا

واعظ بُتوں کو خلد میں لے جائیں گے کہیں — ہے وعدہ کافروں سے عذابِ الیم کا

بُت خانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے — مومن! بس اب معاف! کہ یاں جی بہل گیا

دشمنِ مومن ہی رہے بُت سدا — مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا؟

ہائے ہائے صنم لب پہ کیوں؟ — خیر ہے مومن! تمھیں کیا ہوگیا

ذکرِ بتاں سے پہلی سی نفرت نہیں رہی — کچھ اب تو کفرِ مومنِ دیں دار کم ہُوا

مومن! اُس بُت کے نیم نازہی میں — تم کو دعوائے اِتقا نہ رہا

بُت کدہ جنت ہے چلیے بے ہراس — لب پہ مومن! ہر چہ بادا باد کیا

کعبہ سے جانبِ بُت خانہ پھر آیا مومن — کیا کرے؟ جی نہ کسی طرح سے نہار لگا

ایسے سیکڑوں اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں، لیکن مومن کے یہاں ایسے بھی بہت سے اشعار ملتے ہیں جن میں دوسرے مذاہب و مسالک کے پیرو کاروں پر چوٹیں کی گئی ہیں۔ یہ چوٹیں جارحانہ ہیں،

لے نام آرزو کا، تو دل کو نکال لیں — مومنؔ نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

ہم بندگیِ بت سے ہوتے نہ کبھی کافر — ہر جائے گر اے مومن موجود خدا ہوتا

منہ کو مومن سے چھپانا کافر! — یہ تقیہ تو نہ بھایا ہم کو

وہ نکتہ داں کہ تقیہ کو اصلِ دین کہے — دمِ شکایتِ عاشق نہ ہو جفا سے خجل

ہم اور یہ بدعت تپشِ دل کے سبب سے — مومن! مرے سینے پہ ہے بعدِ فنا ہاتھ

مجھے وہ تیغ جو ہر کر مرے نام سے خوں ہو — دلِ صد پارہ اصحابِ نفاق و اہلِ بدعت کا

فروغِ جلوۂ توحید کو وہ برقِ جولاں کر — کہ خرمن پھونک دیوے تجی اہلِ ضلالت کا

دل ایسے شوخ کو مومنؔ نے دے دیا کہ وہ ہے — محبِ حسین کا اور دل سے شمر کا سا

اپنا شریک بھی نہ گوارا کرے بتو! — مومنؔ کو ضد یہ کیشِ بد برہمن سے ہے

نہ کچھ رہِ سنت، نہ طریقِ توحید — پھر کیا ہے غرور سب کی یکساں فہمید

ہم سمجھے ہیں معنیِ حقیقی یعنی — حیواں ہیں حقیقت میں یہ اہلِ تقلید

مومن ہے اگرچہ سب اُسی کا یہ ظہور — توحیدِ وجودی کا نہ کرنا مذکور

یعنی کہ بنائے ہیں خدا نے بندے　　بندے کو خدا بنائے، کس کا مقدور

اپنے مذہب اور مسلک کو اچھا سمجھنا ایک بات ہے اور دوسرے مذاہب و مسالک کے پیروکاروں کو طنز و تشنیع کا نشانہ بنانا بالکل دوسری بات ہے۔ ہر شخص کے نزدیک اُس کا مسلک بہترین ہوتا ہے اور ہر شخص کو اپنے مذہب کا پابند ہونے کا حق حاصل ہے۔ اُردو کے شاعروں کا مسلک بالعموم " با مسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام" رہا ہے۔ اپنے مسلک اور مذہب کی خوبیاں بیان کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔ لیکن دوسرے مذاہب و مسالک کی تذلیل و توہین قارئین اور سامعین پر کوئی اچھا اثر مرتب نہیں کر سکتی۔ ان جارحانہ مذہبی اشعار نے مومن کی مقبولیت اور عظمت کو نقصان پہنچایا اور مرورِ ایام کے ساتھ اُن کا حلقۂ اثر سکڑتا اور سمٹتا چلا گیا۔

جینیس فن کار کو اپنے اعمال و افعال کا خیال آتا ہے، تو وہ اپنے لواحقین بالخصوص اولاد کے لیے زیادہ فکرمند ہو جاتا ہے۔ مرزا غالب اپنے متبنیٰ بچوں کے مستقبل کے لیے ہمیشہ متفکر و متردد رہے۔ اُن کا بس چلتا، تو وہ اُن کے سو برس کا اہتمام و انتظام کر دیتے، وہ اس کے لیے کشکولِ گدائی ہاتھ میں لیے پھرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ یہی کیفیت مومن کی بھی ہے۔ اُن کا اکلوتا بیٹا احمد نصیر خاں اُن کے دوست میر تفضل حسین کے پاس رہتا ہے۔ ۱۲۶۸ھ میں مومن کی وفات کے وقت احمد نصیر خاں بیس اکیس برس کا نوجوان تھا۔ لیکن رہتا میر تفضل حسین کے پاس تھا۔ ایسا نہ تھا کہ مومن اُس کی کفالت نہ کر سکتے تھے۔ بلکہ وہ اُس کی بہتری کے لیے اپنے اعمال و افعال کا سایہ اُس پر پڑنے دینا نہ چاہتے تھے۔ اِسی تحفظ کے پیشِ نظر انھوں نے اسے میر تفضل حسین خاں کے پاس خیرآباد میں چھوڑ رکھا تھا۔

اس تجزیے کا ماحصل یہ ہے کہ مومن ایک جینیس تھے۔ انھوں نے اپنی کوشش سے متعدد علوم و فنون میں مہارت اور شہرت حاصل کی تھی۔ اُن کی تخلیقات میں ان کی ذہانت و فطانت کے وافر ثبوت ملتے ہیں۔ لیکن چوں کہ وہ اپنی طبیعت میں ضبط و نظم پیدا نہیں کر سکے تھے، اس لیے وہ کوئی عظیم کارنامہ یادگار نہ چھوڑ سکے۔

رشید حسن خاں

مومن کی پیچیدہ بیانی

ایک شخص مومن کے منتخب اشعار پڑھے اور دوسرا شخص مومن کے دیوانِ غزلیات کا شروع سے آخر تک مطالعہ کرے، دونوں کے تاثرات بڑی حد تک مختلف ہوں گے، اور تاثرات کا یہ اختلاف اُس طرح کا نہیں ہوگا جس سے ہم دوسرے شاعروں کے مطالعۂ کلام کے نتیجے میں دوچار ہوتے ہیں۔ دیوانِ غزلیات کا مطالعہ کرنے والے کی نظر جگہ جگہ رُکے گی، ذہن اُلجھے گا اور آخر میں عجیب طرح کی جھنجلاہٹ پیدا ہوگی۔ اُس کے ذہن میں کبھی یہ بات نہیں آئی ہوگی کہ مومن کے کلام میں اس قدر ناہمواری ہے۔ بیان میں اس قدر اُلجھاوے ہیں اور پیرایۂ اظہار میں اس قدر پیچیدگی ہے! اور یہ پیچیدگی فکر کی تہ داری سے خالی ہے۔ محض نظر بندی کا کرشمہ ہے۔ ایک طرف تو اُس کے سامنے وہ اشعار ہوں گے جو تعداد میں کم سہی، مگر دل فریبی کی کمی اُن میں نہیں۔ دوسری طرف بڑی تعداد میں بل کہ بہت بڑی تعداد میں ایسے اشعار اُس کو ملیں گے جن میں بازیچۂ الفاظ کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اِس صورتِ حال سے دوچار ہونے کے بعد قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ اِس قدر عجیب اختلاف کی وجہ کیا ہے۔ ایک شاعر جس نے ایسے عشقیہ اشعار کہے ہیں جن میں عشق کی سطح اور اُس کا تصور خواہ بلند نہ ہو، مگر اندازِ بیان کی خوبی سے اور معاملات کی صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور جن کو پسندِ خاص اور قبولِ عام کی سند مل چکی ہے؛ دوسری طرف اُسی شاعر

کے یہاں بڑی تعداد میں ایسے اشعار ہیں جو بیان کی غیر ضروری اور غیر مستحسن پیچیدگی سے گراں بار ہیں اور معنی آفرینی کے اُس بے تہ انداز کی یاد دلاتے ہیں جس کا عام طور پر دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیاتِ شاعری کے ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

مومن کے کلام پر پیچیدہ بیانی جس طرح چھائی ہوئی ہے کہ غزلیں کی غزلیں اُس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں، اُس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصطلاحی معنی ہیں "یہ معنی آفرینی ہے، جس نے پیچیدہ بیانی کا پیرایہ اختیار کیا ہے"۔ شعر میں معنی آفرینی سے مراد یہ ہے کہ مانوس یا عامۃ الورود باتوں میں نئے پہلو نکالے جائیں، یا اُن کو نئے پہلو سے دیکھا جائے۔ دبستانِ لکھنؤ میں ناسخ اِس طرز کے ممتاز ترین ترجمان تھے اور یہ واقعہ ہے کہ اُنھوں نے معنی آفرینی میں یہ کمال حاصل کیا تھا کہ طرزِ نو کے بانی قرار پائے اور یہ متفقہ طور پر کہا گیا کہ ناسخ نے پرانی سادہ گوئی کو منسوخ کر دیا اور ایک نئے طرز کو فروغ دیا جو پرانے انداز سے واضح طور پر مختلف تھا۔ اِس انداز کے نئے پن نے لکھنؤ میں بہت جلد دبستانی اسلوب کی حیثیت سے اپنے کو منوایا اور سکۂ رائج الوقت کی حیثیت حاصل کر لی۔ آپ صرف ایک واقعے سے اِس نئے انداز کی ہمہ گیری کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مصحفی نے اپنے چھٹے دیوان کے دیباچے میں ناسخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "تخلصِ خود را اسم بامسمّیٰ انگاشتہ بر طرزِ ریختہ گویانِ سادہ کلام درعرصۂ قلیل خطِ نسخ کشید، وازتقلیدش برقدمِ او خواجہ حیدر علی آتش ہم در رسیدہ"۔ اِس کے بعد لکھتے ہیں: "اگرچہ حامی ہم از گروہِ سادہ گویاں بود لیکن... در فنِ فارسی مہارتِ کلی داشت... در مجلس ہای مشاعرہ از روی ایں صاحبان... خجالتے نکشید، بلکہ غزلیاتِ ایں دیوانِ ششم را اکثرے بروئیِ ایشاں گفتہ"۔ یہ تحریر ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) کی ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب مصحفی با کمال شاعر اور مسلّم استاد کی حیثیت سے مانے جاتے تھے، دہلی سے نسبت اور سادہ گوئی کی فضیلت پر ایمان رکھتے تھے اور اِس کا اعلان بھی کرتے رہتے تھے؛ اِس کے باوصف اِس نئے طرز کی تقلید پر اُن کو مجبور ہونا پڑا۔

خیر مصحفی تو لکھنؤ میں رہتے تھے اور اُن کو رہنا بھی وہیں تھا اور وہیں کی محفلوں میں کلام کو سرسبز اور اُن کو سرخ رو ہونا تھا۔ یہ صرف شاعری کا مسئلہ نہیں تھا، معاش کا سوال بھی اِس سے وابستہ تھا۔ اِس نئے طرز کی نظر فریبی کا عالم یہ تھا کہ جو لوگ دہلی میں بیٹھے ہوئے تھے اور

اپنی اپنی جگہ پر بھاری پتھر تھے، وہ بھی اِس سے بے طرح یا بُری طرح متاثر تھے۔ شیفتہ کی سخن فہمی اور خوش ذوقی کی بڑی شہرت ہے، اُنھوں نے گلشنِ بیخار میں ناسخ کے تذکرے میں جو کچھ لکھا ہے، اُس کے لفظ لفظ سے ٹپکتا ہے کہ وہ کس قدر متاثر ہیں ناسخ کے اِس نئے طرز سے۔ دو چار فقرے آپ بھی سن لیجیے: "نسیم چمنِ طبعش نکہت ریز و شمیم گلِ فکرش دل آویز — طائر بلند پرواز غورش مجز بشاخِ سدرہ آشیاں نسازد و مُرغِ تیز بالِ خیالش مجز ببامِ فلک جلوہ نیندازد۔ والا مایہ، عالی پایہ، بلند اندیشہ، نازک خیال است و در تلاشِ مضمونِ تازہ و معنیِ سیراب بے مثل و مثال ....." — یہی نہیں، آتش کے تذکرے میں یہ وضاحت کی ہے کہ جو لوگ آتش اور ناسخ کو برابر کا شاعر مانتے ہیں، وہ بڑی غلطی کرتے ہیں، لکھتے ہیں: "و مردمِ آں دیار آتش و ناسخ را..... قریب ہم انگارند و بر دو را ہموزن شمارند، وقباحتِ این تحقیق لایخفیٰ علیٰ من لہ حظ من الفہم۔ و مع ذٰلک، در نکوئیِ طبعش سخن نیست": آپ نے اِس "مع ذٰلک" کو ملاحظہ فرمایا! مطلب یہ ہے کہ آتش، ناسخ کے برابر کے تو نہیں، مگر بہر حال شاعر اچھے ہیں — یہ عالم تھا اُس زمانے میں ناسخ کے اُس نئے طرز کا۔

یہاں پر ایک یہ بات بھی ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے کہ ۱۲۲۴ھ میں، جب مصحفی نے ناسخ کے نئے طرزِ سخن کی شہرت کا اعتراف کیا ہے اور یہ زمانہ گویا ناسخ کے کمال کی شہرت اور اُن کی استادی کا ہے: اس وقت مومن نو دس برس کے ہوں گے اور غالب کی عُمر (قولِ مشہور کے مطابق) ۱۱، ۱۲ سال کی ہوگی یعنی اِن لوگوں نے جب شاعری کا آغاز کیا ہوگا تو اُس وقت شاعری کی فضا ناسخ کی شہرت سے معمور ہوگی اور اُن کے اُس نئے انداز کی دُھوم مچی ہوئی ہوگی اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر یہ دونوں ابتدا میں اس طرز سے متاثر ہوئے ہوں، ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ ابتدائی تاثر مومن کے یہاں گہرا ہوتا گیا اور وہ ساری عُمر کسی نہ کسی صورت میں اِس کے اسیر رہے اور اِس نے اُن کی غزلوں کے بڑے حصے کو بے مزہ اور بے کیف بنا دیا ہے۔ مزید گفتگو سے پہلے مناسب یہ ہوگا کہ مختصر لفظوں میں ناسخ کے اُس نئے طرز کی کچھ وضاحت کر دی جائے۔

ناسخ کے اسلوب میں جو چیز سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے، وہ ہے لفظوں کے نئے نئے تلازمے، جن کی مدد سے وہ مضامین کی تخلیق کرتے ہیں اور ایسی نئی تشبیہیں تراشتے ہیں جن پر

استعارے کا دھوکا ہوتا ہے۔ اِس ظاہر فریب انداز کی دل کشی اُس وقت کچھ اور بڑھ جاتی ہے جب وہ شعر میں ایسے مختلف لفظ جمع کرتے ہیں جن میں بہ ظاہر باہم کوئی نسبت نہیں ہوتی، لیکن اُن کی صناعی کی طاقت اُن سب لفظوں کو اِس طرح منسلک کرتی ہے کہ نئی نئی نسبتوں کے رشتے چمک اُٹھتے ہیں اور پڑھنے والا اچانک ایک عجیب طرح کی حیرت آمیز مسرت سے دو چار ہو جاتا ہے۔اسی کے ساتھ پڑھنے والا ایک خاص طرح کے بلند آہنگ کو بھی محسوس کرتا ہے، ایسا آہنگ جس کو آپ پُر وقار کے لفظ سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔ صرف دو اشعار سے اِس کی وضاحت بہ خوبی ہو سکے گی :

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا　　طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

ہے گلشنِ قرطاس میں کلبانگِ عنادل　　میرے قلمِ قافیہ پرداز کی آواز

ناسخ اُن لوگوں میں سے تھے جن کے نزدیک پھول کے وجود سے زیادہ پھول کا لفظ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ایک بنیادی لفظ کی نسبت سے دوسرے تلازمے فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ اِس انداز کے زیرِ اثر ذہن نئے نئے تلازمے تلاش کرنے میں اِس قدر محو ہو جاتا ہے کہ لفظ کی ثقالت یا مضمون کی رکاکت اُس کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ مضمون کیسا ہی ہو، اُس کو بندش اِس پہلو سے دی جائے کہ خیال کے بعض نئے پہلو چمک اُٹھیں اور یہ معلوم ہو کہ شاعر کی فکر نے آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہوگا تب یہ پہلو ذہن میں آیا ہوگا، مثلاً :

خاک صحرا چھانتا پھرتا ہوں اس غربال میں　　آبلوں میں کر دیے کانٹوں نے روزن زیر پا

ساغر میں عکسِ رُخ، رُخِ گلگوں پہ ہے عرق　　موتی جو آگ میں ہے تو شعلہ ہے آب میں

معنی آفرینی کی اِس ورزش کا ایک روشن پہلو تو یہ ہے کہ کبھی اس میں دل کشی کا رنگ بے طرح چمک اُٹھتا ہے، مثلاً :

منہدی سے ہے شعلہ قدم اُس شوخ پری کا　　پاپوش نے سیکھا ہے چلن کبکِ دری کا

آتشِ رنگِ حنائے شمع ہیں سب انگلیاں　　دستِ جاناں میں مرا مکتوب پروانہ ہوا

کس قدر دل چسپ اور پرفریب ہے یہ انداز! آج بھی ایک لمحے کے لیے تو سننے والا واہ واہ کہنے پہ آمادہ ہو ہی جائے گا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ انداز دیر تک اور دور تک ساتھ نہیں دے پاتا چوں کہ غرض صرف لفظوں سے ہے، وہ کیسے ہی ہوں، اس لیے ذہن مبتذل اور غیر مبتذل میں فرق کرنا روا نہیں رکھتا۔ اور خاص بات یہ ہے کہ اِس طرزِ خاص میں اوسطاً ایسے ہی اشعار زیادہ نکلتے ہیں، مثلاً:

تو لگائے گا جو قاتل سرمۂ دُنبالہ دار　　تیری شمشیرِ نگہ کو پہ تلا ہو جائے گا

گڑ گئے ہیں سیکڑوں شیریں ادا، شیریں کلام　　جابہ جا ہوں چیونٹیوں کے کیوں نہ روزن خاک میں

اب آپ دیوانِ مومن اٹھا لیجیے اور پڑھنا شروع کیجیے تو آپ دیکھیں گے اشعار کا قابلِ ذکر حصّہ اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ یہی انداز ہے۔ نتیجہ بھی اس کا وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔ اپنے رنگ میں اچھے خاصے شعر کہتے کہتے اچانک ایسے شعر کہنے لگتے ہیں جن کو اس رنگ سے قریب کی نسبت ہے اور اس طرح کہتے ہیں جیسے یہ انداز اُن کا خاص ہو اور یہ رنگ ان کے پسندِ طبع ہو۔ میں بعض مثالوں سے اس کی وضاحت کرنا چاہوں گا:

سو تھی منقارِ مرغِ صبح، پہلو سے مرے　　وہ قیامت قد جو اٹھا، حشر برپا ہو گیا
سرمۂ تسخیر سے ہم خود مسخر کیوں نہ ہوں　　آنکھ کی پتلی جو تھی، جادو کا پتلا ہو گیا
کفر ہے بے گل رخِ ترسا تماشائے چمن　　گلشن اپنے حق میں اے مومن کلیسا ہو گیا

کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری　　میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

شورِ الفت نے کیا کیا بے مزہ جلّاد کو　　گرم خونی سے لبِ شمشیر پر تبخالہ تھا
آہِ پُر دود اپنی کب زیبِ فلک تھی رات کو　　دیدۂ مہتاب میں سرمے کا یہ دنبالہ تھا

رقیبوں پر ہوئی کیا آج فرمائش جواہر کی
کہ میرا عاشقِ خطِ زمرد فام لیتا تھا

نسبتِ عشق سے ہوں نزع میں گریاں یعنی
ہے یہ رونا کہ دہن گور کا خنداں ہوگا

بوسہ ہائے لبِ شیریں کے مضامیں ہیں نکیں
نقطے لفظ مرے شعر کا چپاں ہوگا

گر یہی گرمیِ مضمونِ شرر ریز رہی
رشتۂ شمع سے شیرازۂ دیواں ہوگا

جمعِ بسترِ مخمل شبِ غم یاد آیا
طالعِ خفتہ کا کیا خواب پریشاں ہوگا

لگے اُن آنکھوں سے ہر وقت لے دلِ صد چاک
ترانہ رتبہ ہوا کیوں شگافِ در کا سا

ذرا ہو گرمیِ صحبت تو خاک کر دے چرخ
مرا مُرو ہے گُل خندۂ شرر کا سا

میرا گلا ہنسی سے یوں ہی گھونٹتے تھے وہ
کیا سوچ کر رقیب خوش آیا . خفا گیا

جلتی ہے جان آتشِ خس پوش دیکھ کر
چلون سے شعلہ رو کوئی جلوہ دکھا گیا

مہندی ملے گا پانو سے دشمن، تو آن کر
کیوں میرے تفتہ سینے کو ٹھوکر لگا گیا

لے اُڑی لاشہ ہوا۔ لاغر بس تن ہو گیا
ذرۂ ریگِ بیاباں اپنا مدفن ہو گیا

بِن ترے اے شعلہ رو آتش کدہ تن ہو گیا
شمع قد پر میرے پروانہ برہمن ہو گیا

تھی کمیں میں غارتِ بوسِ دہن ہنگامِ خواب
شب کی بیداری سحر کا خواب رہزن ہو گیا

میرے جلنے پر جو رویا غیر تیری بزم میں
سوزِ دل کو آبِ اشک آتش پہ روغن ہو گیا

پانو زنداں سے اٹھے کیا بار اٹھا سکتے نہیں
حلقۂ زنجیر آخر طوقِ گردن ہو گیا

آخر اشکوں کے بھر آنے نے ڈبویا ہے مجھے
چشم کا سوراخ تو کشتی کا روزن ہو گیا

خاک اُڑائی میں نے کیا طرزِ جنونِ قیس کی
شہر ساں آباد سارا نجد کا بن ہو گیا

زخم نو بھی مرہمِ زخمِ کہن ہے چارہ گر
بند تیرِ یار سے سینے کا روزن ہو گیا

نیم جلوے کو بھی وہ کہتے ہیں اب بے پردگی
جسم کا بیدہ یہ کس کا صرفِ چلمن ہو گیا

بس کریں سارے برس رقتا رہا غم میں ترے — جیٹھ اور بیساکھ کا بھی چاند ساون ہوگیا

تاش کا ہمدم کفن لانا کہ بس میں مرگیا — چلونوں سے جلوۂ خورشید سیما دیکھ کر
یاد آیا سوے دشمن اُس کا جانا گرم گرم — پانی پانی ہوگیا ئیں موج دریا دیکھ کر
تھی جہنم وہ نگاہِ گرم بھی سوے عدو — سوجھی اپنی عاقبت کی ہم کو دنیا دیکھ کر
خاک میں کیوں کر نہ لوٹوں بن گیا سوے چمن — اُس کے صحنِ خانہ کا پہناے صحرا دیکھ کر
اُس کے چھٹتے ہی اندھیرا آگیا ایسا کہ بس — گر پڑا ئیں روزنِ دیوار کو وا دیکھ کر
میں نہ مانوں گا کہ چشمِ آبلہ بے دید ہے — یہ نہ دیکھے رہ سے غیر اپنے کفِ پا دیکھ کر
انتظارِ ماہ وش میں تو نہ ہوں آنکھیں سفید — شب یہ وہم آیا ہے سوے چرخِ خضرا دیکھ کر

میرا خیال ہے کہ یہ مثالیں اثباتِ مدعا کے لیے کافی ہوں گی۔ زیادہ مثالوں کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش دیوانِ مومن کو کہیں پر سے کھول لیا جائے۔ ایسی مثالیں مل جائیں گی۔ یہ جو معنی آفرینی کا انداز ہے اور جس کو ناسخ سے نسبتِ خاص حاصل ہے۔ اِس کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ ہر طرح کی رعایتِ لفظی اور بے جا صنعت گری اِس کے ساتھ شاملِ کار رہتی ہے۔ لفظوں کے انتخاب میں بے احتیاطی ایک طرح سے لازمہ ہے اِس کا۔ اور مفہوم کا مبتذل ہونا یہاں کوئی قباحت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کے کلام میں ان سب اجزا نے بہ افراط دخل پایا ہے۔ اِس حد تک کہ مثالوں کو تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، ہر صفحے پر وہ موجود ملتی ہیں۔

یہاں میں دو باتوں کی طرف آپ کی توجہ بہ طورِ خاص مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ معنی آفرینی کے جس انداز کا ذکر کیا گیا ہے، اُس سے ذوق، غالب اور مومن دہلی کے یہ تینوں معروف اور ہم عصر شاعر شروع میں یکساں متاثر ہوئے تھے۔ مگر اِن تینوں کا احوال اور انجام مختلف رہا۔ ذوق نے جلد ہی محاورے اور روزمرّے کی عام دل کشی کا راز سمجھ لیا اور اُن کی توجہ اِس طرف کارفرما ہوگئی۔ اُن کے کلام میں معنی آفرینی کے اُس طرز کے، یا یوں کہیے کہ تقلیدِ ناسخ کے اثرات اور اُس کی مکمل مثالیں بہ آسانی تلاش کی جاسکتی ہیں اور پیش کی جاسکتی ہیں، اور اچھی خاصی تعداد میں۔ محاورے کا احوال یہ ہے کہ وہ معنی آفرینی کے انداز کو پوری طرح نبھا نہیں

پاتا۔ جب ۔ وزمرے کے حسن اور محاوروں کی مفہوم آفرینی کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے گا تو پھر مفرد لفظوں کے نئے نئے تلازمے تلاش کرنے کا عمل اپنی حیثیت کھو بیٹھے گا۔ یہ ذوالگ راستے ہیں یہی وجہ ہے کہ ذوقؔ کے یہاں جلد ہی ایک ایسے انداز نے فروغ پایا جو معنی آفرینی سے ذرا دُور کی نسبت رکھتا ہے ۔ یا یوں کہیے کہ اُن کے یہاں معنی آفرینی کا جو رنگ تھا ۔ جلد ہی اُس نے انداز بدل لیا۔

رہے غالبؔ ۔ تو اُن کی دُنیا ہی دوسری تھی ۔ رنگِ ناسخ کے اثرات اُن کے یہاں سب سے کم ملتے ہیں، اور وہ بھی زمانۂ آغازِ شاعری میں، وہ جلد ہی اُس پھیرے سے نکل گئے ۔ اِس کے مقابلے میں مومنؔ نے سب سے زیادہ ان اثرات کو قبول کیا اور اِس طرح اور اِس حد تک کہ وہ اُن کی شاعری کا ایک امتیازی وصف بن کر نمایاں ہوئے اور نمایاں رہے ۔ یہ شخصیت کی تہ داری ؛ نظر کی بلندی اور ذہانت کی سطح کا فرق تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس چیز کو بیان کی پیچیدگی کہا جاتا ہے ۔ بظاہر وہ غالبؔ کے یہاں بھی ہے اور بہت ہے ۔ مومنؔ کے دیوان کی با ضابطہ شرح اگر ایک لکھی گئی ۔ تو غالبؔ کے کلام کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں : مگر ان دونوں میں جو فرق ہے ۔ ہمیں اُس کو فراموش نہیں کرنا چاہیے ۔ مومنؔ کی ساری پیچیدہ بیانی محض لفظی ہے ۔ وہ صرف اندازِ بیان کی مرہونِ منت ہے ۔ مومنؔ کے پیچیدہ سے پیچیدہ شعر کی شرح کرنے بیٹھیے اور اُس الجھاوے کو سلجھائیے تو معلوم ہوگا کہ بات کچھ بھی نہ تھی ، یعنی اصل خیال میں کوئی گہرائی نہیں سطحی سی اور معمولی سی بات تھی ۔ جس کو بیان اس طرح کیا گیا کہ پڑھنے والا ذرا سی دیر کے لیے مغالطے میں مبتلا ہو جائے ۔ مختصر یہ کہ مومنؔ کے یہاں جو پیچیدہ بیانی ہے ، اُس کے پیچھے کوئی فکری پہلو نہیں ملتا ۔ وہ بے تہ ہے ۔ غالبؔ کے اکثر مشکل اشعار کو سمجھنے کے بعد جس طرح کا احساسِ مسرت اور احساسِ طمانیت حاصل ہوتا ہے ۔ ہم اُس سے مومنؔ کے یہاں دوچار نہیں ہوتے ۔

بے محل نہ ہوگا اگر ہم اس کی وجہ پر بھی غور کرتے چلیں ۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ۔ مومنؔ شروع ہی سے معنی آفرینی کی طرف راغب رہے ہیں اور اِس سلسلے میں اُن پر سب سے زیادہ اثر ناسخؔ کے انداز کا پڑا ہے ؛ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ معیار اور مثال کے طور پر وہ طرز اُن کے سامنے

رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں غالب کے یہاں فارسی کے خیال بند شعرا کے اثرات شامل رہے ہیں۔ فارسی میں خیال بند شاعروں کا اچھا خاصا گروہ ہے۔ مغل حکومت کے آخری زمانے میں اُن کے اثرات بڑھ گئے تھے۔ بیدل اسی گروہ کے نامور شاعر ہیں۔ یہ شاعر گرد و پیش کے اسیر نہیں معلوم ہوتے۔ ان کے اشعار پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان کی دنیا بالکل الگ ہے۔ کہیں اونچی ہوتی ہے۔ جہاں پرچھائیوں کی کثرت ہے۔ ان کے اندر صوفیوں جیسی بے نیازی اور قلندروں جیسی بے پروا خرامی کارفرما نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کو معاشرت کے محرکات سے نہیں، خیالوں کے سایوں سے آب و رنگ ملتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان شاعروں کے یہاں الفاظ کا خلاقانہ استعمال ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ ابہام کے پردے میں معنوی وسعت جلوہ گر ہوتی ہے۔ الفاظ کے خلاقانہ استعمال سے میری مراد یہ ہے کہ الفاظ ان کے یہاں محض تلازموں کا مرکز نہیں ہوتے، اُن کے پیچھے غیر مربوط، مگر توانائی احساس سے بھرپور افکار کی دُنیا آباد ہوتی ہے۔ تلازمے ان افکار کو ساتھ لے کر آتے ہیں اور نقش بنا کر محفوظ کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان شاعروں کے اچھے اشعار پڑھ کر واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ عکس، جن کو الفاظ کی خیالی نسبتیں نمایاں کر رہی ہیں، ذہن کو کسی اور فضا کی طرف لے جا رہے ہیں اور کچھ دیر کے لیے گرد و پیش کے مظاہر سے رابطہ ٹوٹ سا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف معنی آفرینی کے اُس انداز میں جسے ناسخ سے نسبتِ خاص حاصل ہے لفظ، بے جان علامتیں ہیں۔ وہ سطحی تلازموں کے سوا اور کچھ اپنے ساتھ نہیں لاتے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ نظر اوپری سطح کی اسیر رہی ہے۔ ناسخ اور اُن کے مقلد شاعروں کا کلام اُن صفات سے معرا نظر آتا ہے جس کو خیال بند شعرا کا سرمایۂ امتیاز کہنا چاہیے ــــــ فارسی کے خیال بند شاعروں میں بیدل کو یوں افضلیت حاصل ہے کہ اُن کے یہاں افکار کی کارفرمائی سب سے زیادہ نظر آتی ہے اور خاص کر متصوفانہ خیالات اس طرح ادا ہوئے ہیں کہ اُن پر فلسفیانہ افکار کا سایہ پڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس اضافی صفت نے بیدل کے کلام میں ایسی گہری معنویت اور وسیع الذیل تہ داری پیدا کی ہے، جس سے اس قبیل کے دوسرے شعرا کا کلام خالی خالی سا نظر آتا ہے۔ غالب نے بیدل سے جس طرح استفادہ کیا ہے، اُس کا حال معلوم ہے اور انھوں نے اس کا اعتراف کرنے میں خود بھی تکلف سے کام نہیں لیا ہے۔ غالب کی طبیعت کو خود بھی فلسفیانہ انداز سے لگاؤ تھا اور ذہن ایسا پایا تھا جو ان افکار کی بلندی کا امین ہو سکتا تھا۔ اس طرح غالب کے یہاں بیان کی

جو پیچیدگی آئی، وہ صرف لفظوں کا کھیل نہیں تھا۔ غالب کے مشکل اشعار کے پیچھے فکر کی گہرائی ہوتی ہے۔ مختصر لفظوں میں اِس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مومن نے ناسخ کے انداز کو سامنے رکھا ہے، جب کہ غالب نے فارسی کے خیال بند شعرا کی روایت کو اور بیدل کے کلام کو سامنے رکھا ہے جس میں افکار کی دنیا آباد ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں کا انداز مختلف ہونا چاہیے تھا اور دونوں کے یہاں پیچیدگیِ بیان کی سطح بھی مختلف ہونا چاہیے تھی اور ہے۔ یہاں پر یہ بات بھی ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ مومن کا اردو فارسی کا کلام ہمارے سامنے ہے۔ اُس کو مکمل طور پر پڑھنے کے بعد واضح طور پر یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ مومن کے یہاں جذباتی پہلو کیسا ہی تابناک ہو، فکری پہلو نہ ہونے کے برابر ہے۔ اُن کی طبیعت کو عشق و عاشقی سے جیسا لگاؤ ہے، دنیا فکر و فلسفے سے نہیں۔ وسعت کم ہے اور پرواز نیچی ہے۔ یہ معاملہ علم کا نہیں، اُفتادِ طبع کا ہے اور اُفتادِ طبع کے لحاظ سے مومن تماش بین تھے، اور نظیر کے اِس مصرعے کا مصداق کہ: "کٹ کیوں یا دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے۔ علم کے زور سے وہ قصیدوں میں کچھ مشکل مضامین نظم کر سکتے تھے اور نظم کیے ہیں، لیکن اس کا حال سیماکی سی نمود کا ہے۔ جلد ہی وہ اپنے مرکز پر واپس آجاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اِس صورت میں وہ ناسخ ہی کے انداز کو اپنا سکتے تھے، بیدل کا طرز اُن کے پسندِ خاطر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ معنی آفرینی کے شیدا ہو سکتے تھے۔ خیال بندوں کی دنیا سے اُن کو دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے کلیاتِ مومن کے مقدمے میں مومن کے اندازِ بیان پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ: "مومن کی تخلیقی استعداد کا یہ خاصہ ہے کہ وہ غرابت کی جستجو میں رہتی ہے"۔ آگے چل کر اِسی سلسلے میں وہ لکھتے ہیں: "بیان میں فارسی کی یہ کثرت اور اضافتوں کا یہ تسلسل مومن کے عجزِ اظہار کی علامت نہیں، یہ حربہ اِس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ قاری مرعوب بھی ہو اور محظوظ بھی۔ مقصد محظوظ کر دینے والی چونکاہٹ اور غرابت پیدا کرنا ہے۔ غرض غرابت کی یہ جستجو مومن کے ذوق و ذہن کی خاص چیز معلوم ہوتی ہے"۔ (کلیاتِ مومن۔ مجلسِ ترقی ادب لاہور ص۴۲)

سید عبداللہ نے جس چیز کو "غرابت کی جستجو" سے تعبیر کیا ہے، اُس کا تجزیہ اگر کیا جائے تو بعض دلچسپ نتائج سامنے آئیں گے۔ یہ معلوم ہے کہ مومن کو اپنے کمال پر بہت ناز تھا، اِس میں شاعری بھی شامل تھی اور علم و فن بلکہ فنون سے واقفیت کا احساس بھی۔ لیکن صورتِ حال

یہ تھی کہ جہاں تک فارسی زبان کا تعلق ہے، تو شاعر کی حیثیت سے شہرت تھی مرزا غالب کی اور نثر میں بڑا نام تھا مولانا صہبائی کا۔ اُردو کے فروغ کے باوجود، اس وقت تک علمی معاشرے میں فارسی زبان و ادب کی اعلا حیثیت برقرار تھی۔ اِس کے علاوہ، لال قلعہ تصورات کی نگاہوں کا مرکز اب بھی تھا اور سب کچھ کھو جانے کے باوجود ہر اہلِ کمال کے دل میں اُس سے نسبتِ خاص کی تمنا رہتی تھی۔ یہ وہ مرکزیت تھی جس کو عظیم مغل روایت نے ذہنوں میں بسا دیا تھا اور خیالوں کا جز بنا دیا تھا۔ اِس لال قلعے میں شاعری کی مسند پر ذوق بیٹھے ہوئے تھے۔ ذوق کا جو سادہ و صاف، عام فہم اور محاورے کے چٹخارے سے معمور انداز تھا، وہ قبولِ عام کے کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ یہ عام فہم طرز، جس میں روایتی مضامین زبان اور بیان کے حُسن کے ساتھ موضِ اظہار میں آتے تھے، قلعے کی اس فضا میں گونج رہا تھا اور مقبول تھا، جہاں اکثر چیزیں اپنی گہرائی اور ہمہ گیری کھو چکی تھیں۔ ذوق کے جیتے جی یہاں مرزا غالب جگہ نہ بنا سکے، مومن خاں کا کیا ذکر۔ مومن کے مزاج اور طبیعت کا احوال بہت کچھ معلوم ہے۔ اُس کو دیکھتے ہوئے یہ بات بہ آسانی کہی جا سکتی ہے کہ "ناقدر دانی" کے اِس احساس کا ردِ عمل اُن کے ذہن پر اپنے اثرات مرتسم کرتا رہتا ہوگا۔ حکیم احسن اللہ خاں کو مومن سے جس قدر قریبی نسبت تھی، اُس سے اہلِ نظر واقف ہوں گے، اِس کے باوجود مومن وہاں آخر تک نہیں پہنچ سکے۔ انشائے مومن میں حکیم احسن اللہ خاں کے نام ۱۹ خط ہیں، آپ اُن کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ وہ شکووں سے بھرے ہوئے ہیں اور شکایتوں سے معمور ہیں اور سارے شکوے شکایت کا لبِ لباب ہے ناقدریِ زمانہ کی شکایت۔ میں صرف ایک اقتباس پر اکتفا کروں گا:

"از قدر ناشناسی و سخن نافہمی ہیچ کسم خریدار نیست و جواہرِ زواہرم را بہ شبرنگی نیز روز بازارے نہ۔ گردِ کساد آں قدر نشستہ کہ طوفانِ نوح از متاعِ تختہ بندِ من تواند بردن، و زنگارِ ناروائی آں چناں نہ بستہ کہ غبارِ صرصرِ علاو آئینہ ام را بجلا خواہد آوردن۔ یوسفم را بہ کلاوۂ پیرزال نمی خرند و از چاہِ کنعانی بسیم قلب ہم نمی برند۔ با اعجازِ یدِ بیضا تہی دستم و بادمِ عیسوی آزار پرست"۔

ایک بات اور: انشائے مومن کے خط اِس قدر مغلق ہیں اور صنعتوں اور اصطلاحوں سے اس قدر

بھرے ہوئے ہیں کہ بہت سے مقامات کا سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اِس مشکل پسندی اور مغلق نویسی کے پیچھے جذبہ وہی کام کر رہا ہے، یعنی فارسی دانی اور انشا پردازی کی نمود۔ احسن اللہ خاں دہلی ہی میں رہتے تھے اور مومن بھی یہیں تھے، لیکن خط پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ کسی دور بیٹھے ہوئے شخص کو داستان سنائی جا رہی ہے۔ وہ بار بار یہ جتانا چاہتے ہیں کہ طاہر وحید اور ظہوری و نعمت خان عالی کے انداز میں لکھنا تو مجھے آتا ہے۔ وہ اِن خطوں کے واسطے سے اپنی علمیت اور اپنے کمال کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ مخاطب احسن اللہ خاں ہیں اور یوں کہ قلعے سے بھی اُن کا گہرا تعلق ہے اور مومن سے بھی قرابت قریبہ رکھتے ہیں۔ اِس طرح شکوے شکایت کی لے اونچی ہوتی رہتی ہے، مشکل نویسی بڑھتی رہتی ہے اور ناقدر روانی کا شدید تلخ احساس اُس مشکل نویسی میں اظہارِ کمال کے نام پر غرابت اور اغلاق کو بڑھاتا رہتا ہے۔ مومن فارسی کے کیسے ہی ماہر ہوں اور کتنے ہی بڑے انشا پرداز ہوں، مگر یہ واقعہ ہے کہ اُس زمانے میں فارسی کے باکمال کی حیثیت سے دہلی کے علمی حلقوں میں جو منزلت مرزا غالب اور مولانا صہبائی کی تھی، وہ اُن کے حصے میں نہیں آسکی اور یہ بات بلا تکلف کہی جا سکتی ہے کہ بجا طور پر نہیں آسکی۔ اِس کا شدید احساس اُن کی فارسی تحریروں میں نمایاں ہے۔ اپنے آپ کو منوانے کا یہ احساس اُن کے یہاں مشکل پسندی اور غرابت پسندی کے عنصر کو بڑھاتا رہا۔ اِس فرق کے ساتھ کہ اردو شاعری میں اُس کا انداز دوسرا ہے اور فارسی نثر میں دوسرا۔ غالب اور ذوق سے مختلف اور ممتاز انداز پیدا کرنے کے احساس نے بھی اُن کو اُس طرز کی طرف جی جان سے راغب کیا ہوگا جو اُس وقت لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ مقبولیت حاصل کر رہا تھا اور وقت کی آواز معلوم ہوتا تھا اور یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ یہ انداز فروغ پاکر ایسا امتیاز عطا کر سکتا ہے جس کے سامنے دوسرے طرز ماند پڑ جائیں۔

یہ مشہور قول کہ زمانہ سب سے بڑا نقاد ہے، واقعتاً صحیح ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ مومن تھے تو بہت بڑے شاعر، مگر اُن کو محمد حسین آزاد اور مولانا حالی جیسا کوئی شاگرد نہیں ملا، ورنہ اُن کے کمالات لوگوں کے سامنے آجاتے۔ کوئی شاگرد کسی اُستاد کو ادبی قدر و منزلت نہیں دلا پاتا۔ آزاد نے عالمِ ارواح ہی سے ذوق کے سر پر فضیلت کا تاج رکھ دیا، تو اِس سے کیا ہوا! وہ غالب سے بڑے شاعر تو مان نہیں لیے گئے! اور مومن کو کوئی شاگرد نہیں ملا تو

کیا ہوا۔ اُن کی شاعرانہ خوبیوں کا آج ہم سب اعتراف کرتے ہیں۔ ہاں اس بدمذاقی میں ہم مبتلا نہیں ہو سکتے کہ کہنے لگیں کہ میرؔ کے علاوہ اور سب کے دواوین اٹھا لے جاؤ اور اُن کی جگہ مومنؔ کا دیوان رکھ جاؤ۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اُن کی غزلیہ شاعری کا ایک چھوٹا حصہ ایسا ہے جو مومنؔ کو اچھے غزل گو کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رکھے گا اور ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اُن کی غزلوں کا جو سرمایہ ہے اُس کا بڑا حصہ ایسا ہے جس میں معنی آفرینی اور تلاشِ مضمونِ تازہ کے پھیر میں پڑ کر انھوں نے ایسے شعر کہے ہیں جو آج خوش مذاقی کے معیار پر پورے نہیں آتے۔ یہ حصہ بے روح اور بے رنگ اشعار کا مجموعہ ہے اور ایسے اشعار نے اُن کے کلام میں ایسی ناہمواری بھی پیدا کی ہے جو زبان کی فصاحت اور بیان کی لطافت کے منافی معلوم ہوتی ہے۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اُن کی فارسی نثر بے جا تکلف اور ناروا صنعت گری کے بوجھ تلے بےطرح دبی ہوئی ہے اور اسے مولانا صہبائی کی نثر کے مقابلے میں بھی نہیں رکھا جا سکتا، چہ جائے کہ مرزا غالبؔ کی نثر۔ ہاں انسانوں میں جب تک جسم و جاں کا رشتہ برقرار رہے گا اور جسم اور جنس کے مطالبے اپنا حق طلب کرتے رہیں گے، اُس وقت تک مومنؔ کی غزلوں کے وہ اشعار سدا بہار اور مقبولِ خاص و عام رہیں گے جن میں نہ بے جا صنعت گری ہے اور نہ تقلیدی معنی آفرینی۔ بس طلبِ وصل ہے اور شکایتِ ہجر، لذتِ بوسہ و دشنام کا تذکرہ ہے یا رقابت کے طعنے اور ان سب کے وہ متعلقات جو لذت طلبی اور عیش کوشی کے کاروبار میں ہمیشہ پیش آتے رہیں گے۔

پروفیسر وہاب اشرفی

مومن کی غزل گوئی

مومن کی غزل گوئی کے امتیازات کی بحث چند جملوں میں سمیٹی جا سکتی ہے مثلاً یہ کہ ان کے یہاں نازک خیالی اور معنی آفرینی ہے نئی ترکیبیں ہیں اور وہ صاحب اسلوب ہیں۔ ان کے عشق کے پس منظر میں کوئی پردہ نشیں خاتون جھانکتی نظر آتی ہے لیکن ان کی دنیا محدود ہے ان کے یہاں تنوع نہیں، خیالات بھی ناہموار ہیں۔ — لیکن یہ اور ایسے بہت سے امور شاعر کے حقیقی کمالات کی تفہیم میں کلی طور پر معاون نہیں ہو سکتے، — کسی بھی شاعر کی صحیح قدر و قیمت کی تعیین میں کچھ رہنما اصول ہونے چاہئیں تاکہ ان کی بنیاد پر اس کا تنقیدی جائزہ لیا جا سکے۔ ایسے میں چند سوالات مرتب ہوتے ہیں جن کے تشفی بخش جواب کے بعد ہی جانچ پرکھ کا کام بطریقِ احسن انجام پذیر ہو سکتا ہے، چنانچہ مومن کے باب میں یہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ کیا نازک خیالی اور معنی آفرینی اچھی یا معیاری غزل کے خصائص ہیں یا ہو سکتے ہیں؟ کیا نئی ترکیبیں وضع کرنے والا غزل گو اگر اس کے یہاں معنی آفرینی اور نازک خیالی بھی ہو، لازماً اہم شاعر ہوتا ہے؟ یا ہو سکتا ہے؟ کیا صاحب اسلوب ہونا اچھے غزل گو یا شاعر کی شناخت ہے؟ اگر کسی غزل گو کے یہاں کوئی پردہ نشیں خاتون نمایاں ہے تو کیا اس بنیاد پر اس کی غزل قابلِ لحاظ ہو سکتی ہے یا ہے؟ اگر کسی شاعر، چاہے وہ غزل گو ہی کیوں نہ ہو، کے یہاں وسعت نہیں ہے یا اس کی دنیا محدود ہے تو وہ شاعرانہ اعتبار سے اہم نہیں یا یہ لازمی طور پر اس کا نقص ہے؟ اگر کسی غزل گو کے خیالات ناہموار ہیں تو کیا یہ ناہمواری اس کی غزلوں کا عیب ہے؟ مومن کے سلسلے میں یہ سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں

یا اُٹھائے جانے چاہئیں اس لیے کہ ان ہی امور کی عقبی زمین میں مومن کے فضائل اور نقائص بیان کیے جاتے رہے ہیں۔

سب سے پہلے مومن کی غزلوں میں نازک خیالی اور معنی آفرینی کے پہلو کو لیجیے اس بحث میں واضح طور پر دو قسم کے احساسات ملتے ہیں، ایک تو یہ کہ نازک خیالی اور معنی آفرینی کے سبب ان کی بعض غزلیں چیستاں بن گئی ہیں، دوسرا یہ کہ ان ہی کے سبب ان کی غزلیں انفرادیت کی حامل ہیں اور قابل لحاظ ہیں ۔۔۔ میرا خیال ہے کہ نازک خیالی اور معنی آفرینی کسی بھی قسم کی شاعری کے لیے عیب نہیں ہیں بلکہ اس کا امتیاز ہیں، اس لیے کہ یہی وہ نکتے ہیں جن سے اجتہاد کا رشتہ استوار ہوتا ہے، شاعر غور و خوض کے بعد کچھ کہتا ہے تو وہ روایت کی بنی بنائی لکیروں پر نہیں چلتا۔ جدت طرازی کی طرف مائل ہوتا اور اپنے لیے نئی راہ نکالتا ہے یعنی مومن نے یہی سب کچھ کیا ہے، ان کا شعر ہے :

سرشک اعتراف عجز نے الماس ریزی کی
جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتہ طاقت کا

کہنا بس یہ ہے کہ حمد باری تعالیٰ کی سعی میں اندیشے یعنی فکر و تخیل کی طاقت ختم یعنی خون ہو چکی تھی، اس پر اعتراف عجز کے آنسوؤں نے زخم پر الماس چھڑکا۔ اس سے مجروح فکر و اندیشے کا جگر صد پارہ ہو گیا لیکن اس تصور کے اظہار کے لیے جو ترکیبیں وضع کی ہیں وہ یقینی مومن کی اختراعات ہیں مثلاً "سرشک اعتراف عجز" اور "اندیشۂ خوں گشتہ طاقت" حامد حسن قادری کہتے ہیں کہ اس طرز کی بنیاد ہی محض خیال پر ہے، اس لیے آورد اور زبردستی ظاہر ہے، لیکن آج کی تنقید ایسے آورد اور ایسی زبردستی کو گردن زدنی قرار نہیں دے سکتی جبھی جانتے ہیں کہ انگریزی کے میٹافزیکل شاعر اپنی CONCEITS کے اختراع میں آورد اور زبردستی ہی سے کام لیتے رہے تھے۔ DONNE کی مشہور سطریں ہیں :

IF THEY BE TWO, THEY ARE TWO SO
AS STIFF TWIN COMPASSES ARE TWO.

گویا

MOST HETEROGENEOUS IDEAS ARE YOKED TOGETHER
BY VIOLENCE

اس طرز شاعری۔ نو جدید شاعری کو جس طرح متاثر کیا ہے اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں مقصد صرف یہ ہے کہ مومن اپنی اختراعات کے باعث اپنے تخلیقی عمل کی پیچیدہ تماشی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، یقینی ان کا یہ امتیاز ہے اور ان کی انفرادیت کا ثبوت بھی، اس عمل میں وہ غالب کی مشکل پسندی کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے نظر آتے ہیں، چند اشعار دیکھیے :

ہجر بتاں میں تجھ کو ہے مومن تلاشِ زہر
غم پر حرام خوار ، توکل نہ ہو سکا

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

وہ ہنسے سن کے نالۂ بلبل کا مجھے رونا ہے خندۂ گل کا

تلاش زہر کے ساتھ حرام خوار کی ترکیب جو لطف دے رہی ہے محسوس کی جا سکتی ہے، اسی طرح نازِ تابش کی نزاکت کا احساس کیا جا سکتا ہے لیکن تیسرا شعر تو کچھ عجیب ہے، حامد حسن نے اس کے کم از کم چار مفہوم اس طرح رقم کیے ہیں :

"اس کا بہترین مفہوم تو ایک یہی ہے کہ "وہ" سے مراد گل ہے یعنی گل نالۂ بلبل کو سن کر ہنستا ہے تو مجھے اس کے ہنسنے پر رونا آتا ہے کہ یہ معشوق نے عاشق کی اچھی قدر کی ۔

لیکن دوسرا مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ مجھے خندۂ گل پر رونا آتا ہے کہ وہ دوسرے کی مصیبت پر ہنستا ہے اور اپنی مصیبت و انجام سے بے خبر ہے، خود گل کا خندہ کب تک ؟

تیسرے معنی اس طرح پیدا ہوئے ہیں کہ "وہ" سے مراد مومن کا محبوب ہو، یعنی محبوب نالۂ بلبل پر ہنستا ہے اور اس کے عشق کو حقیر سمجھتا ہے تو مجھے خندۂ گل (گل کی شگفتگی) پر رونا آتا ہے کہ جو بلبل کا معشوق ہے اس کی وہ محبوب کیا قدر کرے گا

ایک چوتھا مطلب بھی نکالا گیا ہے کہ محبوب اپنی سنگدلی کی وجہ سے نالۂ بلبل

شیدا پہ ہنستا ہے اور میرے دل میں ایسا درد ہے۔ دل ایسا دُکھا ہوا ہے کہ خندۂ گل
پر بھی رو پڑتا ہوں"۔ اچھے شعر کی ایک پہچان اس کے ابعادِ معنی میں بھی مضمر ہے۔
مومن کی غزلوں کے کتنے ہی اشعار ایسے ابعاد کا پتہ دیتے ہیں۔
معنی آفرینی اور نازک خیالی محض مشکل اشعار کا مزاج نہیں، سامنے کے الفاظ بھی برتے جائیں اور تخلیق
وصف بھی رکھتے ہوں تو اشعار معنی کے اعتبار سے تہہ دار ہو سکتے ہیں یہ صورت غالب کے یہاں بھی دیکھی
سکتی ہے اور مومن کے یہاں بھی۔ مومن کے چند متعلقہ اشعار میرے موقف کو واضح کریں گے:

نہ ٹھہرے بس آئینہ کو دیکھ کر
وہ اتنا کہ دیکھیں تماشائے غش

سمندر کر دیا آتش رخوں نے
کہ گر پڑتا ہوں آتے ہی نظر آگ

وصل بتاں کے دن تو نہیں یہ کہ ہو وبال
مومن نماز قصر کریں کیوں سفر میں ہم

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

شکوہ نہیں غیر کے ستم کا
انصاف کرو تو میں بھی کیا ہوں

یہ اور بہت سے ایسے دوسرے اشعار میں تخلیق کی آنچ کا احساس کیا جا سکتا ہے اور معنی آفرینی کی جہتوں
کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، پہلے شعر میں عاشق و معشوق دونوں ہی غش کھاتے ہیں معشوق آئینہ دیکھتے
ہی غش کھاتا ہے، غش تو عاشق بھی کھاتا ہے لیکن بعد میں اس طرح معشوق کو اس کی خبر نہیں، دوسرے

شعر میں ہے کہ آتش رخوں نے عاشق کو آگ کا کیڑا بنا دیا ہے۔

تیسرے شعر میں بڑی بلاغت ہے کہا گیا ہے کہ وصل بتاں کے دن ہوتے تو نماز قصر کی جاسکتی تھی لیکن سفر میں اس کا کیا جواز۔ چوتھے شعر میں لفظ 'صاحب' سے معنی کی ایک اور جہت پیدا ہو رہی ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی، اور آخری شعر میں 'میں بھی کیا ہوں' کا ٹکڑا کیا لطف پیدا کر رہا ہے، محسوس کرنے کی بات ہے۔

ان باتوں سے اس بات کی از خود وضاحت ہو جاتی ہے کہ مومن صاحب اسلوب شاعر ہیں، انفرادی اسلوب کا حصول آسان نہیں ہے، اس کام میں ایک ایک لفظ کی نبض شناسی لازمی ہے، وہ شاعر جو لفظوں میں جدلیاتی روح پھونک سکتا ہے وہی صاحب اسلوب بھی ہو سکتا ہے، ورنہ لفظ کا جامد معنی اسے اپنی راہ بنانے نہ دے گا، مومن اس سر میں بڑی طاقت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، سہل ممتنع کے زبان زد اشعار ایک بار پھر دیکھئے:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ہجر پردہ نشیں میں مرتے ہیں زندگی پردہ در نہ ہو جائے (پوری غزل)

مجھ پہ طوفاں اٹھائے لوگوں نے مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے (پوری غزل)

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو (پوری غزل)

اب اور سے لو لگائیں گے ہم جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے (پوری غزل)

گویا مومن کے اسلوب شعر کی دو واضح جہتیں ہوئیں ایک مشکل اور پیچیدہ اور دوسری سہل اور رواں

لیکن ابعادِ معنی سے ہمکنار، خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ "مومن کے یہاں ناسخ اور نصیر دونوں کا انداز ہے، اتنا پیچیدہ اور ژولیدہ کہ دو کم سے کم تغزل کے متعارف اسلوب سے میل نہیں کھاتا اور بعض جگہ اتنا تہ دار اور خوشنما کہ ناسخ اور نصیر سے افضل اور اعلیٰ ہے ...." میری رائے میں اگر مومن تغزل کے متعارف اسلوب کی پیروی کرتے تو یقینی اپنے منصب سے گر جاتے۔ ان کی انفرادیت تو یہی ہے کہ دونوں طرح کے اسلوب میں انھوں نے اپنی راہ بنانے کی کوشش کی ورنہ ان میں اور شاہ نصیر میں کیا فرق رہ جاتا۔

بعضوں کا کہنا ہے کہ مومن کی دنیا محدود ہے، اور ان کے اشعار میں ان کے عشق کی نوعیت کھل ہوئی ہے۔ وہ کسی کسی پردہ نشیں کے عشق میں مبتلا تھے۔ وصل و ہجر کی کشمکش، امید و بیم کی تصویر کشی ہر جگہ موجود ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان کی محدود دنیا ان کی اپنی دنیا ہے۔ جس میں وہ سچے بسے ہوئے تھے، وہ یقینی واقف تھے کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است، لیکن ان کی محدود دنیا میں روایتی، ور خانقاہی عشق پنپ نہیں سکتا تھا اس لیے کہ مجازی عشق کا تجربہ ان کی اپنی دنیا تعمیر کر چکا تھا وہ اسی تجربے میں سرشار تھے اور اس میں بند رہنا چاہتے تھے۔ اگر وہ یہ کرتے تو محض ایک IDEALIST ہوتے اور عشق حقیقی کی غیر تجرباتی فضا میں معلق رہتے۔ یقینی ان کے یہاں عشق کی کیفیت کا اظہار سوانحی ہے اور حیرت انگیز طور پر شاعرانہ بھی۔ امتہ الفاطمہ معروف بہ صاحب جی سے ان کی محبت معروف ہے۔ ایک فارسی قطعے میں اس کے اشارے بہت نمایاں ہیں۔ چند اشعار پیش کرتا ہوں:

تا رفتہ است دلبرِ من از دیارِ من	از درد و غم بہ حالتِ مردن رسیدہ ام
آں آہوے حرم کدۂ حسنِ یوسفی	از من رمیدہ است و من از خود رمیدہ ام
ہمراہ او نہ رفتہ ام از پاسِ عرضِ او	تا آنکہ راہِ دشت و بیاباں بریدہ ام
جاں داد و ہم کشتۂ زبالینِ من گذشت	خوں باد جذب دل کہ بخوں در تپیدہ ام
اے تیرہ روز ہجر رخِ مہر و مہ سیاہ!	دیدی کہ روے او دمِ رفتن ندیدہ ام
سوزم بہ داغِ ہجر ہمانا دلِ خودم	غلطم بہ خاک و خوں مگر اشکِ چکیدہ ام
نازم بہ بخت جانی خود زندہ ام ہنوز	با آنکہ زہر تلخی ہجراں چشیدہ ام
برپا قیامتے شد و جانم زتن نہ رفت	صد بار شور نالہ و افغاں دمیدہ ام

تاریخ وتخرجہ بہ سیالش رسیدو من   در سینہ چاک از غم دوری کشیدہ ام

مذکورہ قطعہ کے اشعار کے ساتھ یہ اشاراتی شعر بھی پڑھنے کے قابل ہیں جن کی عجمی زمین میں مومن کے مادی عشق کے کیف وکم کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے :

صاحبو! میرا حال مت پوچھو   بندۂ سخت بے وفا ہوں میں
چھوڑ دلی کو سہسوان آیا   ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
عذر بے جا ہے سرکشی کے لیے   شاکی بے سبب جفا ہوں میں
اک خداوند شوخ کے غم میں   قابل رحم ہو گیا ہوں میں
مجھے پہنچا دو میرے صاحب تک   کہ غلام گریز پا ہوں میں

تم بھی رہنے لگے خفا صاحب   کہیں سایہ مرا پڑا صاحب

کس پہ بگڑے تھے کس پہ غصہ تھا   رات تم کس پہ تھے خفا صاحب
کس کو دیتے تھے گالیاں لاکھوں   کس کا شب ذکر خیر تھا صاحب

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا   لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

مومن کا ملتہب اور حساس دل اپنے عشق کو فراموش نہ کر سکا ۔ اور وہ اسی کے نت نئے شاخسانے اپنی غزلوں میں پیش کرتے رہے ان کے گوشت پوست کا محبوب ان کی رگوں میں خون کی گرمی اور روانی بڑھاتا رہا ، چناں چہ مثالی اور افلاطونی عشق کی کوئی بنیاد قائم ہی نہیں ہو سکی ، اگر ایسا ہوتا تو پھر مومن کا محبوب پہچانا نہیں جاتا اور بھیڑ میں گم ہو جاتا ۔ مومن یقینی اپنی عشقیہ دنیا میں کھل کھیلنے کا منظر پیش کرتے ہیں ، پھر بھی وہ جرأت نہیں بنتے اس لیے کہ ان کے یہاں پاس ادب بھی ہے ، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی بڑی بلاغت سے اور بہت صحیح لکھتے ہیں کہ مومن نے تغزل میں سچائی کا عنصر پیدا کر کے اُس کو رسمی اور روایتی قیدوں سے آزاد کرانے کی کوشش کی ہے اور اپنی نکتہ یابی ، نازک خیالی اور شوخیٔ ادا سے اسے ترنم کش بنا دیا ہے ان کے یہاں پردہ و چلمن روایت ہی نہیں ، حقیقت بھی ہیں ، انھوں

نے غزل کی فرسودہ روایت پر اپنی انفرادیت کا رنگ چڑھا کر پرانی قدروں کو نئی صورت دی ہے اور غالبا اُردو میں پہلی دفعہ عشق پردہ نشیں کا ذکر ہنر مندانہ توازن اور تحت الشعوری واقفیت کے ساتھ کر کے مواد وہیئت کی دوئی مٹا دی۔ لیکن یہی صورت ایک طرف ان کی شاعری میں گل بوٹے کھلا رہی ہے تو دوسری طرف ان کی دُنیا محدود بھی کر رہی ہے۔ پھر بھی اس میں پہ فکشن اور تکمیلات کا احساس ہوتا ہے، اسی طرح ایک ہو طیقا بنتی ہے کہ محدود دائرے میں بھی اچھی شاعری ممکن ہے۔ اس حد تک کہ قاری خالق کے جذبوں میں شریک ہو جاتا ہے اور اس کے احساسات بھی پوری طرح جاگ جاتے ہیں:

لے شب وصل غیر بھی کاٹی   تو مجھے آزمائے گا کب تک

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں   کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے   تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں   ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ   تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہو چکے   اب عذر کیا ہے رنگ بے حجاب میں

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے   کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری   واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

یہ ممکن تھا کہ مومن اپنے علم طب، علم نجوم اور علم موسیقی سے اپنی دُنیا وسیع کرتے لیکن ان علوم کا استعمال بھی اپنے پیار کے آہنگ کو تیز کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ محبت کی قلمرو میں علم کی بالادستی

کیسے ممکن ہے ؟ مومن اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایسی تشبیہیں اور استعارے جو متعلقہ علوم سے مرتب ہوئے ان کی محبت کی سرشاری کو بس تیز کرتے ہیں :

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

پھیلی شمیم یار مرے اشک سرخ سے
دل کو عجب فشار ہوا پیچ و تاب میں

مومن کو آفاقیت کی تلاش نہ تھی وہ اپنے عشقیہ کیف وکم میں مگن تھے، وہ معنی آفرینی و نازک خیالی کی ایسی بوطیقا مرتب کرتے ہیں جس کے پس منظر میں ان کا اسلوب وضع ہوتا ہے جو اپنی ناہمواری کے باوجود پرکشش ہے اور اردو غزل کے لیے نئی راہیں متعین کرتا ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی

مومن کی پیکر تراشی

پیکر تراشی کا عمل شاعر کے تخلیقی عمل سے وابستہ ہے۔ وہ مادی اشیا، حقائق اور احوال کو اپنے تخلیقی سفر کا نقطۂ آغاز بناتا ہے۔ اور ادراک کو جذبے اور جذبے کو تخیل سے ہم کنار کرتا ہے۔ تخیل ادراک اور جذبے کے کیفِ مرکب میں رنگ بھرتی ہے، اور اس کو نئی معنویت عطا کرتی ہے۔ شاعر کی تخلیقی قوت اس کو ذہنی پیکروں اور علامتوں میں تبدیل کرتی ہے۔ اس عمل میں شعور اور لاشعور ایک دوسرے سے اشتراک کرتے ہیں مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ تخلیقی عمل کے دوران شاعر کا سفر خارج سے باطن کی طرف اور پھر باطن سے خارج کی طرف ہوتا ہے پہلی منزل میں شاعر ادراک تاثر اور کیفیات کو تجریدیت عطا کرتا ہے۔ اور پھر ذہنی پیکروں کو لسانی پیکریت میں تبدیل کر کے اس تجرید کی تجسیم کرتا ہے۔ اس لیے ذہنی پیکروں اور لسانی پیکروں میں ایک نامیاتی تعلق ہے۔ لسانی پیکر ذہنی پیکر کا خارجی روپ ہوتا ہے۔ لسانی پیکر کی تازگی، توانائی اور معنویت کا انحصار ذہنی پیکر پر ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر پیکر مشک نافے کی طرح حسّی کیفیات کا حامل ہوتا ہے لیکن افکار و تصورات نیز زندگی کے تجربوں کے شعور سے توانائی بھی حاصل کرتا ہے۔ وہ تصور اور تصویر کا مرکب ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پیکر کی مٹھی میں تخلیقی جوہر کا جگنو بند ہوتا ہے۔ اس لیے پیکریت کا مطالعہ شاعر کی حسّی کیفیات، تصورحیات و کائنات، اور اس کے فنی شعور کا مطالعہ بھی ہے۔ مومن ایک جمال پرست شاعر ہے۔ اس کے تصور حیات میں جنس اور جمال کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ اس کا ذہن اپنے دور کی مجلسی اور تہذیبی زندگی سے متاثر ہے۔ اس لیے ان کے فکر و فن کا

دائرہ محدود ہے جس کا اثر پیکر تراشی پر بھی ہوا ہے۔ انھوں نے خالص حسّی ابھرے پیکروں کی تخلیق کی ہے۔ مومن کا ذہن تجریدی اور تنزیہی زیادہ اور تجسیمی کم ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مومن نے محض حسّی کیفیات کے اظہار پر اکتفا کیا اور اپنی شاعری میں زندگی کے تجربات اور تاریخ افکار پیش کرنے سے گریز کیا ہے۔ ان کی پیکر تراشی ایک طرح کی صنعت ہو کر رہ گئی ہے، جس میں تصور کم اور تصویریت زیادہ ہے۔ اس میں ایک خاص سطح پر پہنچ کر ڈرامائیت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ مجموعی طور پر مومن کی پیکر تراشی اسلوب کا آرائشی عنصر ہے۔ زندگی کے بصیرت افروز تجربوں کا نقش نہیں۔

مومن کی شاعری میں پیکر تراشی کی کئی سطحیں ہیں۔ مثال کے طور پر مومن کی شاعری میں "شعلہ" ایک بنیادی اور بصری پیکر ہے۔ یہ رنگین اور متحرک بھی ہے۔ حسّی کیفیات کی ترسیل کی بے پناہ قوت رکھتا ہے۔ اس میں تصور کو تصویر بنانے کی صلاحیت بھی ہے۔ مومن کا ایک بہت مقبول شعر ہے ؎

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

مومن نے اس شعر میں محبوبہ یا مغنیہ کو ناہید فلک کا استعارہ بنایا ہے جس کو آسمان کی مطربہ کہا جاتا ہے۔ اُس آسمان کی مطربہ جو مقدس اور پُراسرار ہے۔ مومن نے رشکِ ناہید کی تان کو "شعلہ سا چمک جائے ہے" کہا ہے۔ شعلہ میں گرمی اور روشنی ہے۔ ایک اوچ چمک ہے۔ تحرک اور رنگ ہے۔ اس طرح مومن نے آواز کی دلربائی کے ساتھ اُس کی پُراسراریت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آواز کا وسیلۂ ادراک قوتِ سامعہ ہے۔ اسی لیے آواز سماعی کیفیات کی حامل ہے۔ لیکن مومن نے سماعی کیفیت کے لیے اظہار کی سطح پر سماعی پیکر نہیں تراشا۔ تان کو "شعلہ سا چمک جائے ہے" کہا ہے جو خالص بصری پیکر ہے۔ پیکر تراشی کے عمل میں شاعر کی تخیل مجرد خیالات کو مجسم تو کرتی ہی ہے۔ بلکہ وہ ایک نوع کے حسّی ادراک یا کیفیات کو دوسری نوعیت کے لسانی پیکر میں تبدیل بھی کرتی ہے۔ مواد کی اس انداز کی قلب ماہیت سے فن میں زیادہ گہرائی توانائی اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ مومن نے سماعی نیز ذہنی پیکر کو بصری لسانی پیکر عطا

کر کے اپنے شعورِ فن کا ثبوت دیا ہے۔ مومن کی تخیئل نے تضادات میں مشابہت کے پہلو تلاش کیے ہیں۔ اور کیفیات کے تنوع کو ایک شعری وحدت عطا کی ہے۔ پیکر تراشی کے نقطۂ نظر سے مومن کا یہ شعر بیحد اہم ہے۔ لیکن مومن کے یہاں پیکر تراشی کا یہ معیار آہستہ آہستہ رُو بہ زوال ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مومن کے چند اشعار اور ملاحظہ فرمایئے ؎

ربط اُس سے ہے مثلِ شعلہ و شمع مر جاؤں گر ایک دم جدا ہوں

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے فلس ماہی کے گُلِ شمع شبستاں ہوں گے

تیرے دل تفتہ کی مرقد پہ، عدو جھوٹا ہے گل نہ ہوں گے شرر آتش سوزاں ہوں گے

بن ترے اے شعلہ رو آتش کدہ تن ہو گیا شمع قد پہ میرے، پروانہ برہمن ہو گیا

ہوتا ہے آہ صبح سے داغ اور شعلہ زن کیسا چراغ تھا یہ کبھی گُل نہ ہو سکا

شعلۂ آہِ فلک رتبہ کا اعجاز تو دیکھ اول ماہ میں، چاند آئے نظر آخرِ شب

میں نہ کہتا تھا مصور کہ وہ ہے شعلہ عذار دیکھ تو سوزِ قرطاس پہ تصویر نہ کھینچ

تو آب زن نہ ہووے تو کیا جانے کیا کرے دُشمن کے دل سے میرے دمِ شعلہ زن کی یاد

تھا شب چراغِ خانۂ دُشمن وہ شعلہ رُو کیا کیا جلا ہے صبح تلک جی بسانِ شمع

ان اشعار میں محبوب سے شعلہ و شمع کا تعلق محسوس کرنا، جدائی کے صدمے سے مر جانے کے امکان کی طرف اشارہ کرنا، محبوب کے جلوہ کو شعلۂ دل کے تابِ تابش کے مدِ مقابل رکھنا، خاک میں ملنے کے بعد فلسِ ماہی کو گلِ شمعِ شبستاں کہنا، تربت کے پھولوں کو شررِ آتشِ سوزاں قرار دینا، محبوب کی جدائی میں تن کا آتش کدہ بن جانا اور جلتے ہوئے تن یعنی شمع قد پہ آتش پرست برہمن کا فدا ہونا، داغِ دل اور داغِ بدن کو کبھی گل نہ ہونے والا چراغ قرار دینا، شعلۂ آہِ فلک رتبہ کی بدولت آخر شب میں اولِ ماہ کا چاند نظر آنا، شعلہ عذار کی تصویر بناتے وقت کاغذ کا جل جانا، عاشق کے دمِ شعلہ زن کا دشمن کے ساتھ محبوب کی آب زنی کی بدولت نرم سلوک کرنا، محبوبِ شعلہ رو کو شب چراغِ خانۂ دشمن قرار دے کر اپنے جی کا بسانِ شمع جلنے کا اظہار کرنا، ایک مخصوص اور محدود انداز کی پیکر تراشی ہے جو مومن کے جمالیاتی، ذہنی اور فنی ردِعمل کے اسلوب کو ظاہر کرتی ہے۔ ان پیکروں کے تجزیے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مومن کا ذہن حسن و عشق کی مادی کائنات سے آگے نہیں بڑھتا۔ وہ حسی کیفیات کو پیکروں میں بدلتا ہے مگر ان کیفیات کی بنیاد کمزور ہے۔ اس لیے ان میں وہ معنویت پیدا نہ ہو سکی جو حسی کیفیات کے ساتھ زندگی کے تجربوں، تصورات اور افکار خاص طور پر مابعد الطبیعاتی افکار کی آمیزش سے پیدا ہوتی ہے۔ ویسے اپنی محدود فضا میں یہ پیکر ایک ایسا منظر نامہ ضرور مرتب کرتے ہیں جس پر کیفیات تصویروں کی طرح رقص کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

مومن نے شعلہ کا پیکر اپنے ماحول کی مجلسی اور سماجی فضا سے اخذ کیا ہے۔ شعلۂ دل، شعلہ رو، شعلہ و شمع، شمعِ شبستاں، شررِ آتشِ سوزاں، شمع قد، چراغِ شعلہ زن، شعلۂ آہِ فلک رتبہ، شعلہ عذار اور محبوبِ شعلہ زن کے پیکروں کی موجودگی اس خیال پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔ یہ پیکر مومن کی ذاتی اور جمالیاتی زندگی کی عکاسی کے ساتھ اُن کے عہد کے مجموعی مزاج کی عکاسی بھی کرتا ہے۔
اس لیے یہ پیکر بیک وقت ذاتی بھی ہے اور کائناتی بھی۔ ذاتی اس لیے کہ مومن نے اس پیکر کے ذریعہ اپنے جلتے بجھتے ارمانوں، خوں گشتہ تمناؤں، ناکام حسرتوں اور اپنے سوز و دروں کا اظہار کیا ہے۔ فرقت کی بے قراری اور اُس سے پیدا ہونے والے جذباتی التہاب کو پیش کیا ہے۔ یعنی اپنی حسی کیفیات کی نقش گری کی ہے۔ کائناتی اس لیے کہ یہ پیکر اس دور کے عام رومانی مزاج اور مجلسی زندگی کا عکاس بھی ہے۔ رقیب اور عدو کی موجودگی اسی خیال پر مُہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔ ان پیکروں میں روایت

کا رنگ بھی ہے۔ اور مجموعی ذہنِ انسانی کا آہنگ بھی۔ ایذراپاؤنڈ نے لکھا ہے کہ پیکر بیک وقت ذہنی اور جذباتی پیچیدگی کو پیش کرتا ہے اور مختلف النوع خیالات کو متحد کرتا ہے۔ مومن کے ان اشعار میں شعلہ کا پیکر مومن کے ابھرے جذبات کو پیش کرتا ہے اور تضادات میں مشابہت اور وحدت کو معمولی سطح پر ظاہر کرتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ داخلی سطح پر مومن کے جمالیاتی تجربوں کا دائرہ صرف حسی کیفیات تک محدود ہے اور اظہار کی سطح پر انھوں نے محض بصری پیکر تراشی پر اکتفا کیا ہے۔ ان کی شاعری میں جسم، رنگ، حرکت کو اہمیت حاصل ہے، وہ اُن وجدانی تجربوں اور انسان کی پیچیدہ نفسیاتی کیفیت کی حامل نہیں، جس سے شاعری میں گہرائی اور بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ شعلہ کے پیکر کے ذریعہ مومن نے اپنی حسی کیفیات کے ساتھ اُس دور کی مجلسی زندگی، تہذیبِ عاشقی، اور رندمشربی کا خوش اسلوبی سے اظہار کیا ہے۔ اپنے مخصوص نظریۂ جمال اور جمال پرستی کے رجحان کی نمائندگی بھی کی ہے۔ لیکن تجربے اور تصور سے علیحدہ ہو کر اس پیکر کو زندگی کی بے کنار حقیقتوں کا مظہر نہیں بنایا۔

یہ پیکر مومن کے یہاں فنی لوازمات کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ مثلاً مومن کا ذہن شعلہ کا مجرد تصور نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے ساتھ تلازمات کے شرر بھی رقص کرتے ہیں۔ تلازمات کے بغیر پیکر کا تصور محال ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ شعلہ کے تلازمات اس کی بنیادی کیفیات سے کم اور لسانی اظہار سے زیادہ وابستہ ہیں۔ مثلاً شعلہ کے ساتھ شمع کا، شمع کے ساتھ شبستاں کا، شعلۂ دل کے ساتھ جلوۂ محبوب کا آتش کے ساتھ شرر کا، شعلہ رُو کے ساتھ آتش بدنی کا، چراغِ شعلہ زن کے ساتھ جلنے اور بجھنے کا، شعلہ عذار کی تصویر کے ساتھ مصور کے صفحۂ قرطاس کے جلنے کا، شعلہ رو کے ساتھ شمع کا تصور آنا اسی نوع کی لسانی پیکریت ہے۔ ان تلازمات پر ایک طرف روایت کا گہرا اثر ہے اور دوسری طرف یہ تلازمات شعلہ کے خارجی پہلو کے تلازمات ہیں۔ اس گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مومن کی پیکر تراشی پر ان کے شعورِ فن کی شدید گرفت ہے۔ اس لیے بعض اوقات ان کی پیکریت نے صناعت کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ مومن کو جو ورثہ فن اور شاعری کی صورت میں ملا تھا، اُس سے انھوں نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اور اپنے دور کے شعری معیار کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان کے دور میں ذوق جیسا استاد موجود تھا۔ مومن کی پیکر تراشی FIGURATIVE قسم کی ہے۔ ایج

کو ہے کا خیال ہے کہ پیکر لازنا ایک قسم کا FIGURE OF SPEECH ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر تخلیقی ارتقا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مومن کے پیکروں کو پرکھیں تو ان میں بیشتر ابتدائی نوعیت کے ملتے ہیں۔ جو اکہرے، سریع الفہم اور محدود فضا کے حامل ہیں۔ مومن کی پیکر تراشی پر تشبیہی انداز غالب ہے۔ اس لیے ان میں وہ پُراسراریت اور تہ داری نہیں جو استعاراتی پیکروں میں ہوتی ہے FIGURATVI انداز کی پیکر تراشی اسلوب کو دلکش تو بنا سکتی ہے لیکن زندگی کی گہری بصیرت یا فن کے انتہائی ارفع تصور کو پیش نہیں کر سکتی۔ مومن کی پیکر تراشی کے مطالعہ میں اس نکتہ کو نہیں بھولنا چاہیے کہ انھوں نے پیکر تراشی کو صناعتِ شعر کے انداز میں برتا ہے۔

ابھی ابھی میں نے کہا کہ مومن کی پیکر تراشی FIGURATVI انداز کی ہے جو ان کے اسلوب میں جمال کے عنصر کو بڑھاتی ہے۔ مومن نے اسلوب کی جمال آفرینی کا کام ایک اور انداز سے لیا ہے۔ انھوں نے مناسباتِ لفظی کا سہارا لے کر اپنے پیکروں اور ان کے روایتی تلازمات کو شعر کی پوری ہیئت پر پھیلایا ہے یا یوں کہیے کہ پیکروں اور ان کے تلازمات سے شعر کی خارجی ہیئت کی تشکیل کی ہے۔ یہ کام انھوں نے دو سطحوں پر کیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ اس کا ارتقا دو الگ الگ سمتوں میں ہوا ہے۔ ایک طرف انھوں نے پیکروں کے ذریعہ اپنی کیفیات کو تصویریت عطا کی ہے۔ اور ہر تصویر کو اس کی مکمل جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دوسری طرف انھوں نے حسی کیفیات کو پیکروں کی مدد سے ڈراما بنانے کی کوشش کی ہے۔ جب ان کی حسی تصویریں متحرک ہوتی ہیں تو ان میں ڈرامائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے مومن کی پیکر تراشی ان کے اسلوب کا ایک ایسا عنصر ہے جس سے مومن کے اندازِ بیان کی شناخت کی جا سکتی ہے۔ مثلاً

نامہ رونے میں جو لکھا تو یہ بھیگا کاغذ | کہ بنا ہم گہرِ صفحۂ دریا کاغذ

آوازِ گنبد اُس سے شکایت عدو کی تھی | ناچار چپ ہیں صورتِ دیوار کی طرح

شمع ساں میں سوزِ گریہ سے سراپا جل گیا | ہے تعجب گر شجر پانی کے اندر خشک ہو

سنگِ در سے ترے نکال آگ   ہم نے دشمن کا گھر جلانے کو

رو رہا ہے خندۂ دنداں نما کی یاد میں   آبِ گوہر کے لیے آنکھوں سے دریا جائے ہے

تھا محو رخِ یار میں کیا آئنہ دیکھوں   معلوم ہے یارو مجھے، جو رنگ مرا ہے

اشک دیتے ہیں مرے نالۂ موزوں کا صلہ   موتیوں سے دہنِ زخم گلو بھرتے ہیں

کیا باتیں بناتا ہے۔ وہ جان جلاتا ہے   پانی میں دکھاتا ہے کافور کا جل جانا

شکستہ رنگ پہ مستی میں بنتے ہیں ہم بھی   دکھائیں گے انھیں وقتِ خمار آئینہ

کس کے ہنسنے کا تصور ہے شب ماہ کہ یاں   گدگدی دل میں کوئی آٹھ پہر کرتا ہے

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا   دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

ان میں یا تو ہر شعر ایک مکمل تصویر ہے یا اس میں ڈرامائی کیفیت ہے۔ دونوں صورتوں میں یکساں ہو کر شعر کی ہیئت پر پھیل گیا ہے اور اسلوب کی آرائش کرتا ہے۔ روتے ہوئے خط لکھنے میں کاغذ کا بھیگنا اور اس کا ہم گیرِ صفحۂ دریا ہونا۔ عدو کی شکایت کو آوازِ گنبد دیکھ کر ناچار صورت دیوار چپ ہونا سوزِ گریہ سے شمع کی طرح جلنا اور پانی میں شجر کے خشک ہونے پر تعجب کرنا، دشمن کا گھر جلانے کے لیے محبوب کے سنگِ در سے آگ نکالنا، دیدۂ خنداں نما کی یاد میں رونا، آبِ گوہر کے لیے آنکھوں سے دریا رواں ہونا، رخِ یار میں محو ہو کر اپنی حالت کو آئینہ میں دیکھنے سے گریز کرنا، اشکوں کا موتی بن کر دہنِ زخمِ گلو بھرنا، محبوب کے باتیں بنانے کے فن کو پانی میں کافور جلانے کا انداز قرار دینا، رنگِ شکستہ میں ہنسنے اور مستی میں محبوب کو آئینہ دکھانے کی تمنا کرنا، محبوب کے تبسم کے تصور سے دل میں گدگدی

پیدا ہونا، دیدۂ حیرت کا تماشا کرنا ہیں یا تو تصوریت ہے یا ڈرامائیت، جس کی جڑیں صناعت میں پنہاں ہیں۔ جب یہ رنگ شوخ ہوتا ہے تو تصوریت تجریدیت میں اور ڈرامائیت معاملہ بندی میں بدل جاتی ہے۔ اور پیکر بالکل تحلیل ہو جاتا ہے۔ مثلاً

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں   سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

یا

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس   ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

مومن کی شاعری میں اعلیٰ درجہ کی پیکر تراشی نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ ان کی بیشتر پیکریت FIGUVATVI انداز کی ہے۔ جس کی جڑیں فنکارانہ صناعی سے زیادہ صناعت (CRAFT) میں پوشیدہ ہیں۔ ان کے پیکروں میں استعاراتی پراسراریت نہیں بلکہ تشبیہی شفافیت ہے۔ جہاں کہیں ان کا پیکر سیال ہو کر اپنے تلازمات کے ساتھ پورے شعر پر پھیل گیا ہے وہاں ان میں تصوریت پیدا ہو گئی ہے۔ اور تصویریں متحرک ہو کر ڈرامائیت سے ہم کنار ہو گئی ہیں جہاں یہ تصوریت اور ڈرامائیت زیادہ گہری اور شوخ ہو گئی ہے، وہاں مومن کے یہاں پیکریت مفقود ہو گئی ہے اور صرف تجریدیت رہ گئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مومن کی جمالیاتی کائنات بہت محدود انداز کی جنسی اور جذباتی کائنات ہے۔ ان کا تخلیقی سرمایہ زندگی کے بصیرت افروز تجربوں اور تصورات نیز مابعد الطبیعاتی افکار سے تہی ہے۔ ان کے ذہن پر فنی روایات مجلسی زندگی اور تہذیبی اقدار کا اثر ہے۔ بنیادی طور پر مومن کا ذہن تنزیہی اور تجریدی ہے تشبیہی اور تجسیمی نہیں۔ ایک وہابی کا ذہن تنزیہی ہی ہو سکتا ہے تجسیمی نہیں۔ مومن نے خود ہی اقرار کر لیا ہے۔

سبک روحِ تجرد بھی کہیں پابند ہوتا ہے
شمیم گل کی نقاشو بھلا تصویر تو کھینچو

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

مومن کی جمالیات کا معاملہ

مومن خاں مومن کی شاعری بڑی سخت جان ہے اور میں اسے حیرت سے دیکھتا ہوں!

اِس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ غالب کے عہد میں یہ شاعری اپنی شادابی، بانکپن اور تازگی کے ساتھ نہ صرف زندہ رہی بلکہ اس عہد کے شاعرانہ ماحول پر حاوی بھی رہی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ میر اور غالب کے اعلا ترین جمالیاتی معیار کے باوجود، یہ شاعری آج بھی گفتگو کا موضوع بنتی ہے۔ سوچتا ہوں کچھ باتیں ایسی ضرور ہیں جو اسے اُس زمانے میں زندہ رکھے ہوئے تھیں اور آج بھی اس کی زندگی کی ضامن بنی ہوئی ہیں۔

مومن ۱۸۰۱ء میں پیدا ہوئے اور باون سال کی عمر میں ۱۸۵۱ء میں انتقال کیا۔

ایسے خاندان کے فرد تھے کہ جس کی عمدہ اور نفیس روایات کو پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ چھبیس سال کی عمر تھی کہ والد کا انتقال ہوگیا، ایسا گہرا صدمہ ملا کہ عمر بھر اس کی خلش لیے رہے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت شاہ عبدالقادر سے قریب رہے اپنے والد حکیم نبی خاں کے ساتھ اِن دونوں بزرگوں کی شخصیتوں سے متاثر رہے۔ ذہانت میں اپنی مثال آپ تھے، اردو کے علاوہ عربی اور فارسی زبانوں سے اچھی واقفیت رکھتے تھے، فارسی زبان میں بھی شاعری کی، حدیث، فقہ اور منطق کے علاوہ علم نجوم اور علمِ رمل سے گہری دلچسپی لی، اِس سلسلے میں کئی واقعات

مشہور ہیں، شطرنج اور چوسر کے اُستاد سمجھے جاتے تھے علمِ موسیقی سے بھی دلچسپی تھی، غزلیں کہی، مثنویاں لکھیں، قصیدے لکھے، مخمس اور مسدس لکھے، رباعی، ترجیع بند اور ترکیب بند کی بھی عمدہ مثالیں اُن کے کلام میں موجود ہیں، ایک جانب مذہبی اور روحانی اقدار کو عزیز رکھتے تھے اور دوسری جانب ایسے حسن پسند تھے کہ "عورت" کو تمام حُسن کا مرکز سمجھتے تھے، مومن، صورت پرستی اور حُسن پسندی میں اپنے منفرد رجحان سے پہچانے جاتے ہیں، اُن کا بنیادی تصور یہ تھا کہ کشتۂ نازِ بتاں میں جان کھونے کے لیے اللہ نے پیدا کیا ہے۔

مومن، حُسن کے اظہار کے ایسے شاعر ہیں جو حُسن کے لمحوں اور لمحوں کے حُسن کی شادابی اور تازگی کو محسوسات سے قریب تر کر دیتے ہیں، سراپا نگاری کے بغیر محبوب کے حُسن کو محسوس بنا دیتے ہیں:

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو — ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

دیکھیے خاک میں ملاتی ہے — نگہ چشمِ سرمہ سا کب تک

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا — دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

تو نے وہاں لگائی مہندی — ہاں دل میں لگی نگار آتش

چلنا تو دیکھنا کہ قیامت نے بھی قدم — طرزِ خرام و شوخی رفتار کے لیے

بات کہنے کا انداز ایسا ہے کہ حُسن کا اظہار ہو جاتا ہے اور اُن کا احساسِ حُسن دوسروں کا بھی تجربہ بن جاتا ہے:

دیکھیے ہے چاندنی وہ زمیں پر نہ گر پڑے — اے چرخ اپنے تو مہ کامل کو تھامنا!

محبوب کا ذکر ہو یا زلف و گیسو یا سُرمۂ رنگیں کا لبِ رنگیں کا ذکر ہو یا دستِ حنائی کا، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے حُسن کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہوئے وہ اپنے دل سے ہم کلام ہیں اور

یہ ہم کلامی حُسن کے اظہار کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔ یہ میر کی تازہ روایت سے ذہنی وابستگی کا نتیجہ بھی ہے۔ تجربے مومن کے ہیں اور اندازِ بیان اُن کا اپنا ہے لہٰذا روایت کی روشنی کے باوجود مومن کے شعری تجربے اپنی انفرادیت رکھتے ہیں، شاعر نے حُسن کو کس طرح دیکھا اور محسوس کیا اور وہ اپنے احساسات کو صرف اپنی ذات کے تعلق سے کس طرح بیان کرتا ہے، مومن کے جمالیاتی تجربوں کا امتیازی رجحان ہے!

شاعر کی روایات اور اُس کے ماحول کو پیشِ نظر رکھیے اور اُس کے رنگین اور شاداب تجربوں کا مطالعہ کیجیے تو اس سچائی کا علم ہوگا کہ مومن اُن شعرا کی بہتر نمایندگی کرتے ہیں جو علم میں اضافہ نہیں بلکہ کسی نہ کسی سطح پر جمالیاتی انبساط حاصل کرنے اور اپنے منفرد 'ڈکشن' کے ذریعہ اسے عطا کرنے کے قائل ہیں، حُسن و محبت کے موضوعات میں فطری دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں، قاری کو اپنی لطف اندوزی اور اپنے تخیل کے حُسن میں شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لمحوں کا سکون، لمحوں کی مسرت اور لمحوں کی خلش پیدا کرکے ہیجان اور کرب کی لذت آمیز کیفیتیں عطا کرتے ہیں:

یارب وصالِ یار میں کیونکر ہو زندگی　　نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

شبِ ہجر میں کیا ہجومِ بلا ہے　　زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

بجلی گری فغاں سے مری آسمان پر　　جو حادثہ کبھی نہ ہوا تھا سو اب ہو

داغِ خوں سے میرے وہ حیراں ہوا　　دامن اُلجھا ہے گلِ بے خار سے

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا　　جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

غیر عیادت سے بُرا مانتے　　قتل کیا آن کے، اچھا کیا

چپکے سے ترے ملنے کا گھر والوں کو تیرے　　اس واسطے چرچا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مجموعی طور پر یہ حُسن وعشق کی شاعری ہے جو اکثر لمحوں میں جادو کا کام بھی کر جاتی ہے، موتمن نے اپنے منفرد رجحان اور اپنے مخصوص جمالیاتی تجربوں سے لمحوں کی مسرتیں زیادہ عطا کی ہیں۔ قدِ یار، زلفِ یار، دہنِ رنگیں اور رفتارِ محبوبؔ کی تصویریں ہوں یا ہجر اور وصل کی یادوں کے نقوش ہوں یا غم ودرد کا ذکر، لمحوں کی مسرتیں اور لمحوں کی خلش ملتی رہتی ہے۔ ایسی خلش جو لمحوں میں انبساط عطا کرے۔

دُو افراد کے عشق ومحبّت کے تجربوں کے پیشِ نظر، بلند ترین جمالیاتی انبساط کا تصور اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ فنکار نے جسم 'اور سکس' کے تجربوں کو اَرفع ترین صورت عطا کی اور اسے آرٹ کا قابلِ قدر جاذبِ نظر نمونہ بنا دیا ہے لیکن یہ ہر فنکار کے بس کی بات نہیں ہے

ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا کے بعض اہم شعرا نے دُو افراد کے عشق کے تجربوں کو اتنا شاداب بنا دیا ہے کہ 'سکس' تک جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کلچر، مُعاشرہ، خاندانی روایات اور ذہن کی سطح اور تخلیق وجدان سب اس معاملے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ موتمن عشق کے ایسے ہی تجربوں کے شاعر ہیں۔ اُن کی خاندانی روایات، ان کا معاشرہ، اُن کے ذہن کی تخلیقی سطح اور مجموعی طور پر ان کا کلچر اُنہیں ایک حد تک آگے نہیں لے جا سکتا تھا، وہ انسان کے ایسے جذبات (PASSIONS) کے شاعر کی صورت سامنے آتے ہیں، جو ہمیشہ موجود ہیں اور معمولی سی تحریک اُنہیں متحرک کر دیتی ہے۔

لیکن اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دُو افراد کے عشق کی شدت سے زیادہ عشق کے جذبات کی شدت ہی موتمن کی شاعری میں زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ اچھے اشعار میں معاملہ یک طرفہ سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ محبوب کے ردِّ عمل کا تاثر بہت ہی کم ملتا ہے۔ محبوب کی صورتیں ملتی ہیں، کئی پیکر ملتے ہیں لیکن شخصیت کی کوئی ایک ایسی تصویر واضح طور پر نہیں بنتی کہ ہم ان مختلف صورتوں کو اس شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور جہتوں سے تعبیر کریں۔ اِسے اُردو اور فارسی شاعری کی روایات کی روشنی ہی میں زیادہ سمجھنے کی

ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

مومن کی شاعری کا دائرہ محدود ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کے پہلو مختلف انداز سے اُجاگر ہوتے رہیں۔ جو پہلو ہیں اُن پر بھی طرح طرح سے روشنی ڈالنا ممکن نہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ شاعری پہاڑی چشموں کی مانند نہیں ہوتی لیکن شاعری کنوئیں کی مانند بھی تو ہوتی ہے اور کنوئیں کی صورت اُبھرتی ہے تو اس کی گہرائی میں جھانکنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ مومن کی شاعری کنوئیں کی گہرائی سے بھی محروم ہے۔ محسوسات کی ایک چھوٹی سی پیاری سی دُنیا ہے جو اپنا مخصوص رنگ و آہنگ رکھتی ہے۔ اس کی اپنی ایک پیاری سی عورت ہے جو تخیل کے کئی رنگ لیے ہوئی ہے۔ اس کے حیاتی اور محسوساتی پہلو ہلکے ہلکے طور پر ابھرتے ہیں۔

بلاشبہ مومن نے بعض بنیادی جذبوں کو اپنے منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ رنگین اور پُرکار تجربے کے تخیل سے جاذبِ نظر بن گئے ہیں۔ لب و لہجہ اپنا ہے۔ منفرد دلکشی کے مالک ہیں۔ پرانے تجربے اس لب و لہجے اور اس دلکشی سے نئے بن گئے ہیں۔ اشاروں اور کنایوں سے تجربوں کو معنی خیزی عطا ہوئی ہے۔ قاری کے احساس اور جذبے سے اُنہیں قربت حاصل ہو جاتی ہے۔ بات کہنے یا سنانے کا انداز ایسا ہے کہ اکثر چند لمحوں تک گرفت میں لیے رہتے ہیں۔ ایک مہذب تخلیقی شاعر کا کارنامہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے   کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

میرے تغیّرِ رنگ کو مت دیکھیو   تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

گر دیکھ کے ہنس دیا ہمیں تو   منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے   اُس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا　　دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

غیر عیادت سے بُرا مانتے　　قتل کیا آن کے اچھا کیا

لگے خدنگ جب اس نالۂ سحر کا سا
فلک کا حال نہ ہو گیا مرے جگر کا سا

حیرتِ حسن نے دیوانہ کیا گر اُس کو
دیکھنا، خانۂ آئینہ بھی ویراں ہو گا

ایسی لذّت خلش دل میں کہاں ہوتی ہے
رہ گیا سینہ میں اس کا کوئی پیکاں ہو گا

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم
بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ ہیں کچھ نہیں کہتا

شوخ تمہارا رنگِ حنا میرے لہو سے ہو
قتل اغیار سے کیا ہاتھ ترے یار لگا

ہوتا ہے آہِ صبح سے داغ اور شعلہ زن
کیسا چراغ تھا یہ کبھی گل نہ ہو سکا

ایسے اشعار سے تغزل کا وہ صاف ستھرا معیار سامنے آتا ہے جو اُردو شاعری کی روایات کے مختلف رنگوں سے تشکیل پاتا ہے۔ سنے سنائے تجربے بھی شاداب بن گئے ہیں، تخیل کا حسن اپنی رنگینی

اور پرکاری کو نمایاں کرتا ہے۔ شاعر کی نازک خیالی اور مضمون آفرینی کی پہچان ہوتی جاتی ہے۔ طنز کی لہریں ذکاوتِ حس کو نمایاں کرتی ہیں، ایسے اشعار تجربوں کی تصویریں بن جاتے ہیں لمحوں کی مسرت اور لمحوں کی خلش کو لفظوں نے اشکال کی صورت دے دی ہے محسوسات کی ایک چھوٹی سی پیاری سی دنیا ہے تخیل کے کئی رنگوں کو لیے ہوئے۔ اشارے اور کنائے چند لمحوں تک قاری کے احساس کو گرفت میں لے لیتے ہیں، 'ڈکشن' منفرد ہے شعری تجربوں کو پیش کرنے کا اپنا انداز ہے ـــــــ لیکن سارا دیوان ایسا نہیں ہے، فرسودہ روایتی مضامین، تصنع، صنائع کی بھرمار، پیچیدگی ایسی کہ جسے سلجھایا جائے تو کچھ حاصل نہ ہو، زبان کی خامیاں، کبھی ایک مصرع انتہائی ہلکا اور معمولی اور کبھی دوسرا مصرع بے لطف، ہلکا پھلکا، عشق، محبوب کی بے رخی اور اُس کے ستم، عاشق کی تڑپ اور رقیب کا حسد، محاوروں اور ترکیبوں کی بے جان کیفیتیں، معمولی سطح کی رومانیت جو چلمن پردہ، روزن وغیرہ سے آگے نہیں بڑھتی ـــــــ وہ نقائص ہیں جو 'دیوانِ مومن' میں عام طور پر نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کی جمالیات کی سطح بلند نہیں ہو سکی ہے اس کی جہتیں پیدا نہیں ہو سکی ہیں، رومانیت کا دائرہ محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

اِن باتوں کے باوجود مومن ایک اچھے تخلیقی فنکار ہیں۔

مومن ایک ایسے داستان نگار ہیں جو داستانِ رنگیں کے واقعات کو اِدھر اُدھر سے نکال کر اپنے منفرد لب ولہجہ میں محسوس بنا کر سناتے رہتے ہیں، جمالیاتی نقطۂ نظر سے یہ بات انہیں ایک رومانی مثالیت پسند (IDEALIST) شاعر بنا دیتی ہے۔

رومانی جمالیاتی مثالیت پسندی کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ شاعر لذت اور مسرت کے پانے کے لمحوں کو حسن سے تعبیر کرتا ہے، لذت اور مسرت کے یہ لمحے قاری کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں اور کسی نہ کسی سطح پر حُسن کا احساس عطا کر دیتے ہیں، اس طرح لمحوں کا حسن صرف شاعر کے اپنے ذاتی تجربوں کا حُسن نہیں رہ جاتا، دوسروں کا بھی بن جاتا ہے، "رومانی جمالیاتی مثالیت پسندی" کا کرشمہ یہ ہے کہ تجربہ، جتنا بھی نجی یا ذاتی ہو، ذاتی اور نجی نہیں رہتا، مومن نے کئی معاشقے کیے، جانے کتنی لڑکیوں اور

عورتوں کو جی جان سے چاہا، دو شادیاں کیں۔ صاحب پر فریفتہ ہوئے کسی کی نبض پر انگلیاں رکھیں تو دل ہی نکال کر رکھ دیا، اُن کے عشق کی کئی کہانیاں ہم نے سُن رکھی ہیں، اپنی مثنوی "شکایتِ ستم" میں تو یہ فرماتے ہیں کہ ابھی نو سال کی عمر تھی کہ کسی کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کی مثنوی "قولِ غمیں" امۃ الفاطمہ صاحب جی سے اُن کے عشق کی کہانی ہے۔ ممکن ہے ایسی مثنویوں کی بنیاد حقیقی نجی عشقیہ معاملات ہوں اور شاعر نے انہیں زیبِ داستاں کے لیے اپنے تخیل کی رنگینی سے سنوارا ہو اور اُن کے بعض دل میں چبھ جانے والے اشعار کا تعلق بھی ایسے واقعات سے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں یہ تجربے صرف شاعر کے نہیں رہتے دوسروں کے بھی بن جاتے ہیں، اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ دوسروں کے تجربے نہیں بن پاتے، یہ مومن کا تخلیقی وجدان ہے جو اس طرح متحرک ہوا ہے کہ عشقیہ تجربے دوسروں کے احساس اور جذبے سے ہم آہنگ ہوئے ہیں، یہ بڑی بات اس شاعر کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ رومانی جمالیاتی مثالیت پسند شاعر، کا جمالیاتی تخلیقی وجدان نجی اور ذاتی تجربوں کو بھی زندگی بخش دیتا ہے "موجود شے" کے تئیں جتنی بھی بیداری ہو "موجود شے" سے جتنا بھی تعلق ہو، اس سے جتنا بھی واسطہ یا رشتہ ہو، مثالیت پسند شاعر کا جمالیاتی احساس اسے ایک نئی صورت عطا کرنے کی کوشش کرتا ہے، حسن INTRESTED DELIGHT سے DISINTRE-STED DELIGHT کا نمونہ بن جاتا ہے، نئی جمالیات نے اسے "جمالیاتی مشابہت" سے تعبیر کیا ہے اور ایسے شعری تجربوں کو اہمیت دی ہے۔

مومن جمالیاتی بصیرت کے نہیں بلکہ جمالیاتی مسرت کے ایسے شاعر ہیں جو چھوٹے چھوٹے عام طور پر محسوس کیے ہوئے تجربوں کو ذہنی کیفیتوں سے ہم آہنگ کر کے جمالیاتی انبساط عطا کرتے ہیں، چونکہ مومن کی شاعری کا دائرہ محدود ہے، اس کی جمالیات کے حدوں میں بھی وسعت نہیں ہے، شعری تجربوں کی گہرائی اور پہلو داری ہی جمالیاتی انکشافات کرتی ہے، اس لیے مومن کے مطالعے میں ہم جب بھی جمالیاتی انبساط کا ذکر کریں تو اس سچائی کو ذہن میں رکھیں کہ جمالیاتی مسرت یا جمالیاتی انبساط اُس وقت حاصل

ہوتا ہے جب ہم کسی بڑی اعلیٰ تخلیق کو اپنے احساس اور جذبے سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ شیکسپیر کے ڈرامے، غالب کا دیوان، گوتم بدھ کا مجسمہ، اجنتا کی تصویریں اور تاج محل — اعلیٰ ترین تخلیقی کارنامے ہیں کہ جن سے بے پناہ جمالیاتی بصیرت اور بے پناہ جمالیاتی آسودگی اور جمالیاتی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہاں معاملہ کچھ اور ہے، عشق کا موضوع یقیناً نفسیاتی اور جذباتی اور عالمگیر اور ابدی ہے لیکن اس موضوع کے تجربے "تاج محل اور نہ دیوانِ غالب، شیکسپیر کے ڈرامے ہیں اور نہ بدھ کا مجسمہ اور اجنتا کی تصویریں، ایسے جمالیاتی تجربوں سے جمالیاتی انبساط، اسی حد تک حاصل ہو سکتا ہے جس حد تک اُن میں عطا کرنے کی صلاحیت ہے، عموماً ایسے تجربوں کی بنیاد اُلغو کے مرکزی احساسِ حسن اور احساسِ آسودگی اور مسرت و انبساط پر ہوتی ہے کہ جس میں اچانک اُبھرنے، پھیلنے، تہہ دار اور پہلودار بننے اور اپنے ارتعاشات (VIBRATIONS) کو پھیلانے کی صلاحیت نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ موضوع جتنا بھی عالمگیر ہو، تخلیق عالمگیر نہیں بن پاتی۔ جو لوگ جمالیاتی استغراق (AESTHELIC CONTEMPALION) اور جمالیاتی ادراک (AESTLIELIC COGMLION) کے فرق کو سمجھتے ہیں وہ اس سچائی کو یقیناً جان لیں گے، جمالیاتی استغراق کا تصور صدیوں کے تجربوں کی آمیزش اور آویزش کے بغیر بھی پیدا ہو سکتا ہے لیکن جمالیاتی ادراک کا تصور صدیوں کے مسلسل سفر اور اُن کی آمیزشوں اور آویزشوں کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتا، مومن اور اس سطح کے دوسرے شعرا کو اس روشنی میں دیکھا اور پرکھا جائے تو جمالیاتی مسرت یا جمالیاتی انبساط کی ایک ایسی سطح کا بھی احساس ملے گا جو جمالیاتی استغراق کا نتیجہ ہے اور قیمتی ہے۔

مومن ایسے "رومانی جمالیت پسند غزل نگار" کہے جا سکتے ہیں جو اپنے جمالیاتی تجربوں کے ساتھ اپنے عہد کا اخلاقی معیار بھی لے آئے ہیں، اُن کی شاعری میں حُسن و عشق دونوں اخلاقی اقدار کی علامتیں بن گئے ہیں، اُن کا پُر کیف حیاتی لب و لہجہ یا SENSORY MEDIUM اکثر اُن کی شاہد بازی، صورت پرستی، رنگین مزاجی اور عاشق مزاجی کو تازگی بخش دیتا ہے، غزلوں کے اشعار اور خصوصاً اُن کی مثنویوں کے عشقیہ واقعات

ایسے ذہن کا احساس دیتے رہتے ہیں جس کی تربیت میں روایات اور اُس عہد کی اخلاق
اقدار نے حصہ لیا ہے۔ تخیل کی رنگین کاریوں اور رندی اور ہجر و وصال وغیرہ کے مضامین
میں جذبوں کی تہذیب کا عمل غالباً اِسی وجہ سے قائم ہے۔

'ایغو' کے مرکزی احساسِ حسن کی شدت نے اِس شاعری کو جنم دیا ہے اور بنیادی
معاملہ یہ ہے کہ شاعر ایسی شاعری کے جمالیاتی تجربوں سے اپنے طور پر زیادہ سے زیادہ لطف
اندوز ہو، جمالیاتی آسودگی حاصل کرے۔ اپنے تجربوں سے اسے مسرت اور انبساط ملے۔
یہی وجہ ہے کہ مومن کی شاعری مجموعی طور پر 'ذات' اور اس کے تجربوں کا اظہار ہے۔ شاعری
میں اس طرح ذات کا اظہار یا انکشاف کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ "سچائیوں" کے انکشافات
ہوتے رہیں۔ سچائی، کا انکشاف یا اظہار نہیں ہوتا، اچھی شاعری تو ذات کا انکشاف دلفریب
جھوٹ اور جمالیاتی التباس کے ساتھ آتی ہے 'خیال' اور 'شے' کی آمیزش ہوتی رہتی ہے اور
پھر دونوں ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ ایسے باطنی جمالیاتی عمل کے بعد جمالیاتی
تجربہ جنم لیتا ہے۔ مومن کے انکشاف ذات (SELFRLVELAHIAR) کو اسی روشنی میں دیکھنا
چاہیے، دیوانِ مومن میں جو تجربے جمالیاتی بنے ہیں وہ محض لفظوں کی دلکشی اور رنگینی سے
نہیں بلکہ نفیس اور لطیف احساسات کی وجہ سے اور ان ہی نفیس اور لطیف احساساتی تجربوں
سے اُن کے کچھ حیاتی پہلو پیدا ہوئے ہیں اور رمزیت اور ایمائیت قابلِ توجہ بنی ہے۔ ان
کے مطابق 'ڈکشن' ملا ہے۔ یہ 'ڈکشن' نہ ملتا تو یہ شاعری اتنی قابلِ توجہ نہیں بنی۔ 'ڈکشن' نفیس
اور لطیف احساسات کی دین ہے۔

مومن کے حسن پسند رجحان نے عموماً ذات اور محبوب کے درمیان اشاروں اور
کنایوں کا ایک لطیف رشتہ رکھا ہے لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ مومن کی
شاعری میں محبوب، عاشق کے وجود کا حصہ نہیں بنتا۔ یوں اس کی جانے کتنی تصویریں
سامنے آتی ہیں، اُس کی رنگین اور دلکش پرچھائیاں اُبھرتی رہتی ہیں۔ عاشق، اُن تصویروں
اور پرچھائیوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور اپنے مشاہدات اور محسوسات کو پیش کرتا رہتا ہے۔ محبوب
جتنا بھی حسین اور خوبصورت ہو، قاری کی توجہ شاعر کے اظہارِ بیان کی جانب زیادہ رہتی ہے

جزوات کے اظہار انکشاف اور مشاہدات اور محسوسات کا نتیجہ ہوتا ہے، مومنؔ نے محبوب کو اپنی ذات اور اپنے وجود کا حصہ بنالیا ہوتا تو صورت کچھ اور ہوتی، مومنؔ غالباً یہ نہیں کر سکتے تھے! جمالیاتی وحدت کی یہ کمی اُردو کے اکثر شعرا کے کلام میں ملتی ہے۔ غالبؔ کی شاعری میں یہ جمالیاتی وحدت ایک ارفع ترین معیار کو پیش کرتی ہے، مادّی، رُوحانی یا حیاتی کیفیتوں کی وحدت نہیں ہوتی تو محبوب کی ایک عمومی صورت بن جاتی ہے۔ ہم ایسی عمومی صورتوں سے جتنے بھی متاثر ہوں، محبوب کی شخصیت محسوس نہیں ہوتی۔ محبوب اپنی تہہ دار جہتوں سے متاثر نہیں کرتا اور اُس کے مختلف ردِّ عمل کا کوئی احساس نہیں ملتا، وہ کائنات اور فطرت کے حسن اور وجود کی بے پناہ گہرائیوں کے اضطراب سے رشتہ نہیں رکھتا، مومنؔ کے عشقیہ مضامین کی شدت سے انکار نہیں لیکن عاشق کے جبلّی، احساساتی، رومانی اضطراب اور محبوب کی شخصیت سے قاری کے احساس سے کوئی ایسی ہلچل پیدا نہیں ہوتی کہ قاری کچھ اور، کچھ اور جاننے، دیکھنے اور سمجھنے کے لیے بے چین ہو جائے، اُس میں ایسے ارتعاشات پیدا ہو جائیں کہ وہ مزید انکشافات کے لیے مضطرب ہو جائے۔ جمالیاتی تجربے کی بس ایک سطح ابھرتی ہے، اُس سے رشتہ بھی قائم ہوتا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ جمالیاتی تجربے کی ایک سے زیادہ سطحیں اُبھریں اور احساس کو طرح طرح سے آسودگی حاصل ہو، ایک جلوے میں کئی جلوے نظر آنے لگیں۔

اُس قیامت قد کو شب دیکھا تھا ہم نے خواب میں
دل نے محشر کا سماں وقتِ سحر دکھلا دیا!

کس کی زلفوں کی بُو نسیم میں تھی
ہے بلا آج پیچ و تاب ہمیں!

دیکھیے خاک میں ملاتی ہے
نگہِ چشم سرمہ سا کب تک!

اس دہن کو غنچۂ گل کیا کہوں
ڈر لگے ہے مسکرانا چھوڑ دے!

آمد آمد ہے چمن میں کس صنم انداز کی
سبزۂ خوابیدہ سے مخمل بچھاتی ہے بہار!

پھر پیرہن کے ہوتے ہیں ٹکڑے برنگِ گل
پھر مجھ کو آگئی کسی گل پیرہن کی یاد!

دل کا کیا حال کرے دیکھیے گرمیِ حُسن
ٹھہرتا آئینۂ یار میں سیماب نہیں!

اور اس قسم کے دوسرے اشعار خوبصورت ہیں لیکن قد، زلف، رفتار، دہن، چشم، گرمیِ حسن، اور پیرہن وغیرہ کے باوجود محبوب کی شخصیت نہیں بنتی اور اسی وجہ سے دیوانِ مومن میں یہ شخصیت محسوس نہیں ہوتی۔

مومن نے اکثر بار بار دہرائے ہوئے تجربوں کو اپنی خوبصورت "ڈکشن" میں پیش کیا ہے، یہ تجربے ایک عام سا احساس ہی پیدا کرتے اگر مومن کے "ڈکشن" نے انہیں سہارا نہ دیا ہوتا۔ اُن کے عشقیہ معاملات سے ہم کسی حد تک باخبر نہ ہوتے تو نفسیاتی طور پر ایسے تجربوں سے اتنا رشتہ بھی غالباً پیدا نہ ہوتا۔ ایک شاعر نے اتنے عشق کئے، بڑا عاشق مزاج تھا چلو دیکھیں اپنے جمالیاتی تجربوں کو کس طرح پیش کرتا ہے اور جب ہم قریب آتے ہیں تو عام اور معمولی تجربوں کا ایک انبار ملتا ہے۔ تلاش کرتے ہیں تو جواہر ریزے مل جاتے ہیں، ان کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس شاعر کا منفرد اندازِ بیان اتنا جاندار ہے کہ بار بار دہرائے جانے والے تجربے ہم سے قریب تر آجاتے ہیں کچھ اس طرح کہ ان سے نئی تازگی کا احساس ملنے لگتا ہے۔ مومن کی شاعری اس لیے اہم نہیں ہے جیسا کہ پروفیسر کلیم الدین احمد نے کہا ہے کہ ان کے شعروں میں 'واقعیت' ہے یا 'جزئیات'

سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصلی واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ "واقعیت" اور "اصل واقعات کی جانب اشارے" سے کوئی کلام اہم اور قابلِ توجہ نہیں بن جاتا۔ اگر مومن نے کسی حد تک مصنوعی جذبات سے پرہیز کیا ہے تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حیاتِ معاشقہ کی داستانیں بہت حد تک حقیقی ہیں۔ اگر "واقعیت" کو علیحدہ کر دیں اور اُن کی حیاتِ معاشقہ کو نہ دیکھیں تب بھی ان کے کلام کے بعض حقیقی جذبات شعری پیکروں میں اتنا ہی اثر پیدا کرتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر ان تجربوں سے رشتہ پیدا کرنے میں حیاتِ معاشقہ کی اہمیت تو ہے لیکن کلامِ مومن کی تعریف اس طرح نہیں ہوگی کہ اُن کا کلام اس لیے اہم ہے کہ وہ اصل واقعات کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اُن کے "ڈکشن" کی ایک بڑی بات یہ ہے کہ اظہار بے باکانہ ہوا ہے اور لفظوں کی پرکاری، رنگینی اور دل آویزی نے اظہار کو پُرکشش بنا دیا ہے اور اُن کے "ڈکشن" کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ "ڈکشن" "امیجری" سے محروم ہے۔ صورتیں بنتی ہیں لیکن حسن اور جمالیاتی پیکر نہیں بنتے۔ صورتیں اور تصویریں "امیجری" کی خصوصیتوں سے محروم ہیں۔ اسی عہد میں غالب جیسا صورت گر موجود ہے اس لیے بھی کلامِ مومن میں آنکھیں متحرک اور پہلودار اور جہت دار "امیجز" کو بھی تلاش کرتی ہیں۔ جو "ڈکشن" "امیجری" سے محروم ہو وہ ادھوری ہوتی ہے۔ اُردو شاعری میں میرؔ اور غالبؔ نے تو اس کا ارفع ترین معیار قائم کر دیا ہے۔

مومن کا "ڈکشن" اُن کے مخصوص مزاج کی پیداوار ہے یہی وجہ ہے کہ یہ اپنی نزاکت سے پہچانا جاتا ہے۔ شخصیت کا سوز و گداز، تجربوں کے ذریعہ "ڈکشن" میں بھی پیدا ہوا ہے۔ اکثر ان کی ترکیبیں تجربے کے پیش نظر جاذبِ نظر بن جاتی ہیں۔ شخصیت کے سوز و گداز سے تجربوں میں تاثیر پیدا ہوئی ہے، اکثر تجربوں کو اپنے منفرد انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہم اُنھیں رسمی تجربوں سے لاکھ تعبیر کریں، وہ رسمی نہیں رہ جاتے۔ شاعر کے تخیل کی کارفرمائی اور اسلوبِ بیان کے حسن سے یہ تجربے اُن کے اپنے بن جاتے ہیں۔

دیوانِ مومن میں عشق کا تصور گہرا اور بلیغ نہیں ہے۔ ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ شاعر اپنے باطن کی گہرائیوں میں دُور تک اُترا ہے۔ باطنی اضطراب، باطنی تصادم اور باطنی جلش کی شدت نہیں ملتی۔ سطح کا سکون اور سطح کی ہلچل سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اندر کوئی بڑا

طوفان ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈکشن میں حسی پیکر اور امیجز نہیں ملتے۔ باطن کا شدید تجربہ ہی جمالیاتی حسی پیکروں کو خلق کرتا ہے۔ جب حسی پیکر اور امیجز کی کمی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ شاعری علامتی نہیں بن پائی ہے۔ اس کی اگر کوئی علامتی سطح ہے تو وہ بہت معمولی اور عام سطح ہے، وہ رومانی جمالیاتی مثالیت پسند شاعر جو ہر لمحہ عشق و حسن کا ذکر کرتا ہے کسی قسم کی کوئی خوابناک فضا خلق نہیں کرتا، اپنے خوابوں اور اپنے خوابوں کی علامتوں اور ان علامتوں کی علامتی سچائیوں سے آشنا نہیں کرتا۔ مومن مشاہدات (OBSERVAfioNS) کے مثالیت پسند شاعر ہیں اور مشاہدات علامتیں عطا نہیں کرتے۔ حیرت تو یہ ہے کہ مشاہدوں کا بھی کوئی ایسا رومانی عمل ظہور پذیر نہیں ہوتا جو پیکروں اور علامتوں کو کسی بھی سطح پہ خلق کرے۔ یہ ذہن اپنے بنے بنائے دائرے سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ مومن کی دلچسپی علم موسیقی اور علم نجوم سے بھی تھی پھر بھی اُن کا ذہن بنے بنائے ہوئے محدود دائرے سے باہر نکل کر دوسرے دائروں تک نہیں پہنچتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ایغو نے اپنی صلاحیتوں کو بہت کم جانا پہچانا، اپنے محدود دائرے میں دیوانہ اور مست رہا۔ چاہتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس کی ذات کا رشتہ حیات و کائنات سے قائم نہ ہو جاتا۔ بچی اور ذاتی تجربے اس رشتے کی بدولت پیکروں اور امیجز کی دنیا عطا کر دیتے!

صدیق الرحمٰن قدوائی

مومن کے نقّاد

مومن ہمارے بہت اہم شاعروں میں ہیں۔ ان کے عہد سے لے کر آج تک ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا۔ شیفتہ جیسے تذکرہ نگاروں نے روایتی انداز میں ان کی تعریف کے پل باندھے اور انھیں اردو فارسی کے سب ہی شاعروں سے بلند تر قرار دیا۔ پھر امداد امام اثر اور حسرت جیسے لوگوں نے ان کے کلام کے محاسن و معائب کا جائزہ لیا۔ حسرت نے شاید سب سے پہلے مومن کے بارے میں کسی حد تک تفصیل کے ساتھ جچی تلی رائے دی اور اپنی عقیدت مندی کے باوجود اپنے عہد کے معیاروں پر انھیں جانچنے کی کوشش کی۔

ضیا احمد بدایونی صاحب کا مرتب کیا ہوا دیوانِ مومن، اس پر ان کا مقدمہ اور اشعار کی تشریحات مطالعۂ مومن کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ انھوں نے مومن کی شاعری کے محاسن کو پہلی بار اہلِ مذاق کے سامنے بھرپور طور پر پیش کیا۔ مومن کے سلسلے میں اس تنقیدی مطالعہ کی اہمیت آج بھی کم نہیں ہوئی۔ نیاز فتح پوری نے مومن شناسی کو نگار کے مومن نمبر کے ذریعے ایک نئے انداز سے متعارف کرایا۔ نیاز صاحب نے کلام مومن کے شعری حسن کو ان کے اشعار کے نازک پہلوؤں کو اور ان کی جمالیاتی اور جذباتی فضا کو جس طرح اجاگر کیا۔ ان سے پہلے اور شاید ان کے بعد بھی کوئی نہ کر سکا۔ نگار کے مومن نمبر میں نیاز صاحب کے علاوہ اثر لکھنوی، نظیر صدیقی اور امتیاز احمد کے مضامین بھی اہم اور دلچسپ ہیں۔ حیدر آباد کی اُردو مجلس کے مجلّے کا خاص شمارہ بھی مطالعۂ مومن میں اضافہ کرتا ہے جناب عالم خوندمیری،

کا مضمون مومن کی محبت کے نفسیاتی پہلو کا ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ کلب علی خاں فائق نے مومن کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں اہم تحقیقی کام کیا۔ اپنی کتاب کے تنقیدی حصے میں انھوں نے مومن کے بارے میں مختلف مصنفین کے خیالات کو بھی یک جا کر دیا ہے۔ عبادت بریلوی کی کتاب 'مومن اور مطالعۂ مومن' ایک مفصل لیکن سرسری جائزہ ہے۔ اس زمانے میں مومن پر سب سے معتبر اور معلومات آفریں کام ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا ہے۔ ان کی دونوں کتابیں 'مومن شخصیت اور فن' اور 'انشاے مومن' مطالعہ مومن کے لیے ناگزیر اہمیت کی حامل ہیں۔ حق تو یہ ہے مدتوں سے اردو اور فارسی میں مطالعہ مومن بس ان ہی چند کتابوں کے گرد گھومتا رہا ہے۔

مومن کے نقادوں کا مطالعہ کرنے کے بعد چند سوالات سامنے آتے ہیں۔ جن سے اس مضمون میں بحث کی گئی ہے۔

مومن کے نقادوں کو غالب نے آج تک ایک کل نہ بیٹھنے دیا۔ مومن کے فضائل کا ذکر کرتے ہوئے بھی غالب کا سایہ ان کے ذہن کی فضا پر اتنا گہرا ہوتا ہے کہ ان کی پسند کچھ چھپی چھپی رہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم نے بہت بڑی شخصیتوں اور ان سے کچھ کم تر لوگوں کی الگ الگ اہمیت کو قبول کرنے کی بجائے یہ سمجھ لیا کہ جو بہت بڑا نہیں وہ اس قابل بھی نہیں کہ اس کی طرف توجہ دی جائے۔ یا ہم اگر کسی کو اپنی توجہ کے لائق سمجھیں تو اسے بہت بڑا ثابت کرنے کی کوشش کریں ورنہ اس کی طرف متوجہ ہونے کا جواز کیا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم جس شخص پر توجہ دینے لگتے ہیں اسے بڑوں کے بالمقابل کرنے کے لیے نیچے سے سہارا دے کر اپنی سکت کے مطابق اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا بڑی شخصیتوں کی بڑائی میں کچھ کتر بیونت کر کے انھیں اپنے ممدوح کے قد کے برابر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انجام ظاہر ہے ہمارا موضوع اپنی کسی خامی کا نہیں خود ہماری خفت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور اس کے اصل مرتبے کا تعین تو درکنار اس کے منفرد کارنامے بھی مجادلے اور موازنے میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ اس پھیلی ہوئی دنیا کی طرح ادب کی سطح پر بھی نمودار ہونے والی شخصیتوں کے ساتھ اسی طرح کی ناانصافی ہوتی رہی ہے۔ مومن بھی ان میں سے ایک ہیں۔ مومن کی شاعری ہماری بہترین عشقیہ شاعری کا حصہ ہے اور رہے گی۔ مومن خود

اپنے پیروں پر کھڑے ہیں مگر ہمارے نقادان کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر اور بڑا کرنے میں ان کی اپنی خوبصورتی سے لوگوں کی نظریں ہٹانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ مومن غالب کے زمانے میں نہ ہوئے ہوتے تو میر کے زمانے میں ہوتے، یا پھر اقبال کے ہم عصر ہوتے۔ جہاں بھی ہوتے وہ رہتے تو مومن ہی۔ مومن کے نقادان کی ناقدری کے اسباب بیان کرکے ان کی ناقدری کا جواز فراہم کرنے لگتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غالب کو حالی جیسا نقاد ملا جو مومن کو نہیں نصیب ہوا۔ ذوق کو تو محمد حسین آزاد جیسا انشا پرداز مل گیا تھا۔ ذوق کہاں تک چھپ سکے؟ نظیر اکبر آبادی کو ایک دو تذکرہ نگاروں نے نہیں کم و بیش سب ہی نے نظر انداز کیا۔ انھوں نے نظیر کا کیا بگاڑ لیا؟

نقاد کی سفارش سے کاغذ آگے بڑھ سکتا ہے مگر ضروری نہیں کہ اس کو شرفِ قبولیت بھی مل جائے۔ مومن کی شاعری کو کسی بڑے نقاد کے سہارے کا محتاج سمجھنا مومن سے ہمدردی نہیں بلکہ ان پر ظلم ہے۔ پھر مومن پر ان کے عہد سے لے کر آج تک جو کچھ لکھا گیا اُسے سراسر نظر انداز کر دینا بھی زیادتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مومن کی مذہبیت ان کی مقبولیت کے آڑے آئی۔ میر انیس کی شاعری میں مذہب نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اقبال کے ہاں مذہب کا اثر کیا مومن سے کچھ کم ہے؟ پھر وہ آج تک مقبول کیوں ہیں! اُن لوگوں میں بھی جو اُن کے مذہبی اعتقادات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے؟ دراصل جب مذہب شاعری بن جائے تو شاعر اور شاعری کا CALIBRE اہم ہو جاتا ہے اور اصل سوال یہ ہوتا ہے کہ اس کے معتقدات خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، تخلیقی عمل سے گزر کر جمالیاتی قدر بن جاتے ہیں یا نہیں۔ اچھی شاعری کافروں کی بھی جنت ہوتی ہے۔ چنانچہ مومن کی شاعری کو بھی ان کے مذہب سے نقصان پہنچنے کا کوئی خطرہ نہ تھا بشرطیکہ وہ شاعری ہوتی مناظرہ بازی نہیں۔

اسی طرح کسی اُستاد کو خاطر میں نہ لانے یا دربار کا سہارا نہ لینے سے بھی مومن کی شاعرانہ عظمت کے گھٹنے یا بڑھنے کا کوئی تعلق نہیں۔ ان کی پیچیدہ اصطلاحات یا دور از کار تراکیب والے اشعار کو اگر الگ کر دیا جائے تب بھی ان کے کلام کا جو حصہ بچتا ہے وہ ان کی مقبولیت کے لیے کافی ہے۔ حسرت موہانی نے تو ان کے معائبِ سخن کی نشاندہی کرنے کے باوجود کہا کہ "آپ اس میں سیکڑوں ایسے شعر پائیں گے جن کو دیکھ کر دل و دماغ کو فرحت

اور سرور اور روح کو کشادگی اور بالیدگی ہوگی۔ حکیم مومن خاں مرحوم کے اردو کلام میں جتنی غلطیاں ہیں اتنی شاید ان کے برابر والے ہم عصروں میں کسی کے دیوان میں نہ ملیں گی ..... اگر اتنی غلطیاں لکھنؤ کے کسی شاعر سے سرزد ہوتیں تو اس کی نسبت کوئی استادی کا گمان بھی نہ کرتا۔ لیکن مومن خاں کی استادی کو جس چیز نے قائم رکھا وہ ان کی فارسی زبان سے طبعی مناسبت تھی جس کو دیکھ کر پڑھنے والا ان کی لغزشوں کو فراموش کر دینے پر مجبور ہو سکتا ہے۔

غالب کا دیوان اگر انتخاب ہے تو مومن کے دیوان کا بھی انتخاب کر لیجیے۔ دیوان کی ضخامت کسی کے شاعرانہ مرتبے پر کوئی اثر نہ ڈالے گی۔

مومن کو غالب کے طلسمی حصار سے بچا کر نکالنے کے لیے ایک اور اسم اعظم جیسی چیز نکالی گئی اور وہ تھی غزلیت یا تغزل۔ کہا جانے لگا کہ تغزل میں مومن غالب سے بڑھ کر ہیں۔ فرض کر لیجیے کہ ہیں، تب بھی غالب پر کون سی آنچ آجاتی ہے۔ مومن کی غزل کی رنگینی، عاشقانہ کیفیات کی دلروزی، حسن کی اداشناسی، جذبات کا والہانہ اظہار انیسویں صدی کی دلّی کے معاشرے میں ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان محبت کے رشتے کی نزاکتیں اور پھر کمالِ ہنر کے ساتھ ان کا شعر میں ڈھل جانا یہ سب وہ باتیں ہیں جن سے مومن کے اشعار پڑھنے والا کوئی شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور مومن کے عہد سے ہی اس کا پورا اعتراف ہونے لگا تھا۔ اس میں بھی کوئی ہرج نہیں اگر مومن کی شاعری کا دائرہ یہیں تک محدود رہا۔ جو شعرا دوسرے ذہنی و جذباتی تلاطموں میں گھرے رہنے کے ساتھ ساتھ عشق کی کیفیتوں سے بھی آشنا رہے ہیں اُن کے ہاں اور باتوں کے ساتھ حسن و عشق کے معاملات بھی ملتے ہیں۔ کہیں کسی صورتِ حال میں ان کا کوئی شعر اپنا جادو جگائے گا اور کہیں مومن کا۔ اور مومن کی شاعری تغزل تک محدود ہی سہی، تغزل کو صرف مومن تک محدود کیوں کیجیے۔ اردو میں غزل کے ارتقا کو پیش نظر رکھیے تو یہ بات قابلِ اعتنا نہیں رہ جاتی کہ غزل کو صرف "حکایت از جوانی اور حدیثِ زناں" پر ہی ختم سمجھا جائے۔ قدیم دور سے آج تک غزل میں ہر طرح کے موضوعات نہ صرف آئے ہیں بلکہ حسن و عشق کے معاملات کی طرح اپنا جادو جگاتے ہیں۔ دل و دماغ کی فضا پر چھا بھی جاتے ہیں۔ اظہار کی سطح پر تغزل پُراسرار یعنی دُنیا جہان کی ہر بات حسن و عشق کے پردے

میں کہی جائے آج لازم نہیں۔ اور پہلے بھی لازم نہیں تھا۔

مومن کے بارے میں نیاز فتح پوری کا مضمون اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ انھوں نے ان کے کلام کی خوبیوں کا بڑا دلکش تجزیہ کیا۔ مگر ان کو پڑھنے کے دوران میں بھی کبھی مقامات پر احساس ہوتا ہے کہ وہ غالب کے جادو کو توڑنے کی کوشش میں ان کے حصار سے نکلنے کی بجائے اور زیادہ پھنستے چلے جاتے ہیں۔ وہ بغیر کسی شہادت کے لکھتے ہیں کہ غالب نے طرز بیدل میں ریختہ کہنا مومن کے کلام کو دیکھنے کے بعد شروع کیا۔ پھر چونکہ غالب اپنی فطرت کی بنا پر یہ نہ چاہتے تھے کہ لوگ مومن کا متبع سمجھیں اس لیے انھوں نے اس میں بہت گہرا رنگ پیدا کرنا چاہا اور اس طرح کلام مومن سے امتیاز پیدا کرنے کے لیے اول اول ان کے قلم سے اس قسم کے اشعار نکلے جو باوجود نقلِ تراکیب کے کوئی ندرتِ مفہوم نہ رکھتے تھے ......

جراحت تحفۂ الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ

لیکن جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ انداز شاعری نہ محمود ہے نہ مقبول تو مجبوراً انھیں پھر مومن کی سطح پر آنا پڑا اور اس میں شک نہیں کہ غالب اس میں بہت کامیاب ہوئے۔ ذیل کے اشعار کو اگر آپ مومن کے اشعار میں ملا دیجیے تو امتیاز دشوار ہو جائے گا۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا الخ۔ (پانچ اشعار)

ذرا غور فرمائیے کہ یہ بات غالب اور مومن میں سے کس کے لیے باعث فخر ہو سکتی ہے کہ ان کے کلام میں اپنی پہچان نہ ہو۔ دونوں کی انفرادیت اتنی کمزور ہو کہ ان کی امتیازی شان ختم ہو جائے، ان کا لہجہ دب جائے، ان کے الفاظ بے جان ہو جائیں۔ اور یہ بات تو بالکل پا نو چلتی نظر نہیں آتی کہ غالب نے طرز بیدل محض مومن سے الگ ڈانٹ میں اپنایا ہوگا۔

اسی مضمون میں ایک جگہ اور نیاز صاحب مومن کے چند اچھے شعر نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں اور بالکل بجا طور پر یہ فرماتے ہیں کہ ان کے اشعار کے ساتھ ہم اس فضا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے میر و درد کی شاعری کے حدود شروع ہوتے ہیں۔ پھر مومن کے اشعار پیش کرنے کے بعد شاید نیاز صاحب کو میر کے اشعار یاد آنے لگتے ہیں تو ان کے دل میں بیٹھا ہوا ایک اور نیاز کہتا ہے کہ "اب بھی کسر تو رہ گئی"۔ اور پھر نیاز صاحب فرماتے ہیں:

"مومن کا اصل رنگ یہ نہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں ہو سکتا کہ ان کی محبت ذرا اور بلند ہو جاتی تو پھر آج یہ جستجو نہ ہوتی کہ اردو شاعری میں دوسرا میر کون ہو سکتا ہے"

میر کی محبت کے بلند و پست کسی سے چھپے ہوئے تو ہیں نہیں۔ اور پھر مومن کی محبت میں وہ کون سی بات ہے جو اُسے بلند نہیں ہونے دیتی۔ اور پھر ایسی بھی کیا آفت ہے کہ اگر کوئی دوسرا میر اردو میں نہ پیدا ہوا تو دل ٹوٹ جائے۔ محبت کے معاملے میں نیاز صاحب نے مومن کو میر سے کم تر مان کر اور تو جو کچھ بھی کیا ہو بہر حال وہ نہ کر سکے جو ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے کیا۔ مومن کے ہاں میر سے زیادہ داخلیت کے عناصر کی تلاش میں وہ مثنوی تک پہنچتے ہیں ستم یہ کرتے ہیں کہ موازنے کے لیے مومن کی جس مثنوی کا انتخاب کرتے ہیں وہ تو ہے "قصہ غم" جہاں انھوں نے اپنے عشق کا قصہ لکھا ہے اور میر کی اس مثنوی کو بھول کر جہاں انھوں نے اپنا قصہ غم بیان کیا ہے، "دریائے عشق" اٹھا لیتے ہیں اور دونوں کے منتخب اشعار ساتھ ساتھ نقل کر کے میر کو مومن سے کم تر بنا دیتے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ اگر صدیقی صاحب میر کے عشق کی داستان بھی ان ہی کی زبان سے مثنوی میں سنتے تو مومن تو کیا ہیں۔ پوری اردو شاعری میں اس کی مثال نہ ملتی۔

اُردو تنقید کی ریاضیات میں داخلیت اور خارجیت کی اصطلاح الجبرا کے x سے بھی آگے کی چیزیں ہیں۔ اور آسانی یہ ہے ان کی جو قدر آپ چاہیں متعین کر دیں۔ حسبِ خواہ نتیجہ آپ سے آپ نکلتا چلا آئے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ خارجیت زیادہ تر لکھنؤ میں اور داخلیت زیادہ تر دہلی میں نکلنی چاہیے۔ یہ بات نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ کوئی بھی خارجی شے فن کار کی داخلی کیفیات کا جزو بنے بغیر شاعری میں قابلِ اعتنا ہو ہی نہیں سکتی۔ محبوب کا سراپا ہو، موسموں کا ذکر ہو، میدانِ جنگ کا نقشہ ہو، عمارتوں کا ذکر ہو یا جانوروں کا۔ نظیر، انیس، اقبال سے لے آج تک کی نظمیں اس کا ثبوت ہیں۔

مومن کے عشق کے سلسلے میں ایک اور بحث شاعری اور اخلاق کے تعلق کے بارے میں چھیڑی جاتی ہے۔ اور مومن کی جگہ مومن پرست نقاد احساسِ جرم میں مبتلا نظر آنے لگتے ہیں۔ دنیاوی عشق کو غیر اخلاقی بات قرار دے کر اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ شاعری اور اخلاق کا کوئی

تعلق نہیں۔ نیاز صاحب کہتے ہیں" دنیا میں کسی کتاب کے بارے میں یہ گفتگو کہ وہ اخلاق پر اچھا اثر ڈالتی ہے یا بُرا لایعنی سی بات ہے۔ اگر کوئی تنقید ہو سکتی ہے تو وہ یہ کہ وہ اچھی لکھی گئی ہے یا بُری۔" ضیا احمد صاحب اور ظہیر احمد صاحب بھی اخلاق اور شاعری کو بالکل الگ الگ رکھنے پر اصرار کرتے ہیں اور جب وہ مومن کی عشقیہ شاعری کا اخلاقی جواز نہیں فراہم کر پاتے تو اسے اُس شاعری سے کمتر قرار دیتے ہیں جہاں عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی کے درمیان فرق نہ ہو سکے۔

ضیا احمد صاحب فرماتے ہیں :

"سب جانتے ہیں کہ اُن کا عشق حقیقی نہیں مجازی ہے ظاہر ہے کہ ایسے عشق میں بہ تشنگی اور نامرادی، ربودگی اور خود فراموشی کا کیا کام وہاں تو عاشق یہ چاہتا ہے کہ تھوڑے سے ایثار کے سہارے معشوق سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کیا جائے عجب نہیں کہ اس داو پیچ کے کاروبار نے اُن کو تصنع آمیز اور پیچدار باتوں کا خوگر بنا دیا ہو۔"

ظہیر صاحب فرماتے ہیں :

"اگر ان کے عقاید میں تصوف کی گنجائش ہوتی تو شاید وہ زیادہ بھرپور طریقے سے اپنے آپ کو محبت کے جذبے کے سپرد کر دیتے جس طرح میر نے کیا تھا... وقتاً فوقتاً عشق کے دھارے کی طرف کھنچتے ہیں مگر آخر اُن کی مذہبیت اُن کو اس میں بالکل ڈوب جانے سے بچا لیتی ہے۔"

غور فرمایئے کہ مومن کے ڈوبنے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی، اور پھر مذہب آج تک عشق میں کب آڑے آیا ہے۔ مومن ہی کی روایت کو لیجیے تو حسرت موجود ہیں۔ اور تو اور داغ کی ذاتی زندگی میں مذہبی امور کی پابندی، نماز، روزہ، حج کس چیز کی کمی تھی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ تمام عمر میں پانچ عشق کیے جن میں سے دو رگ و پے میں سرایت کر گئے۔ ایک منی بائی حجاب کا اور دوسرا خواجہ معین الدین چشتی کا۔

مومن کے عشق کو مومن کی ذات سے الگ کر کے اپنے IMRIHITION کی تاریکی میں

دیکھا جائے گا تو یہی ہوگا۔ اخلاق اگر ایک انسانی قدر ہے تو اسے شاعری یا دنیا کے کسی فن سے بھی الگ نہیں رکھا جاسکتا۔ ہاں سماج کی تبدیلی کے ساتھ اخلاق بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اخلاق کو اگر ہم ایک جامد تصور سمجھ کر ہر صورت میں یکساں طور پر منطبق کرتے چلے جائیں گے تو اسی طرح کا خلطِ مبحث ہوگا۔ اردو کی عشقیہ شاعری کے اس پہلو پر گفتگو کرتے وقت ذہن میں یہ بھی رکھنا پڑے گا کہ ہمارے سماج میں عورت کی حیثیت کس طرح تبدیل ہوتی رہی ہے، ورنہ ایک مرد کا ایک عورت سے اظہارِ عشق اس طرح کرنا کہ محبوب کی شخصیت اپنی تمام دلآویزی کے ساتھ نظر آئے اور دونوں کے جذباتی تعلقات کی نزاکتیں بھی شاعری کا رنگ بھرنے لگیں غیر اخلاقی ہی لگے گا۔ گویا جب تک عورت چھپی ہوئی ہے، اس کا وجود موہوم ہو، اسے خدا سے CONFUSE کیا جاسکے تب تک تو عشق اخلاقیات کے اصولوں پر پورا اترتا ہے۔ یہاں طوائف اور مطرب پسر سب جائز ہوجاتے ہیں۔ مگر جہاں ایک نارمل قسم کی گھریلو خاتون سے عشق خواہ اس کا ذکر "پردہ نشیں" کے نام سے ہی کیوں نہ ہو اخلاق سوز بن جاتا ہے۔ چنانچہ مومن کے نہایت شریفانہ عشق میں بھی ہمارے نقادوں کو ایک آنچ کی کسر نظر آتی ہے۔

مومن کو اختر شناسی کا دعوا تھا۔ اور اگر یہ اُن کی پیشین گوئی تھی تو زندگی میں نہ سہی موت کے بعد صحیح ثابت ہوئی۔

اللہ رے گم رہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

دراصل ہوا یہ ہے کہ ہماری ادبی تنقید میں افراد اور ان کے کارناموں پر بہت زور دیا گیا۔ مگر رجحانات اور رویوں کا مطالعہ اس طرح نہ ہوسکا جیسا کہ درکار تھا۔ شاید اس لیے کسی شاعر کی نگارشات کا الگ تھلگ مطالعہ کرنا، اور پھر اس کے استاد اور شاگردوں کے اسالیب سے اس کے طرزِ شاعری کے سرے جوڑ دینا نسبتاً سہل ہے۔ مگر ایک بڑے ادبی فکری اور تہذیبی تناظر میں کسی فن کار کی حیثیت کے تعین کی کوشش کرنا اتنا آسان نہیں۔ آج کے زمانے میں نفسیات، عمرانیات اور فلسفے نے تجزیہ و تحلیل کے ایسے طریقِ کار اور تصورات فراہم کیے ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور ترقی یافتہ زبانوں کی ادبی تنقید میں اس کی مثالیں

ملتی ہیں۔ اگر اس نقطۂ نظر سے ہم اپنے ادبی سرمائے کا مطالعہ کریں تو بہت سے ایسے افراد کی انفرادیت اُجاگر ہوگی جواب تک چند عظیم فن کاروں کی چکا چوند میں معمولی نظر آتے ہیں۔ اس طرح کے مطالعے سے ادب کے نئے حقائق سامنے آئیں گے۔ اور یہ وہم ٹوٹے گا کہ یہ دنیا صرف چند عظیم ہستیوں کے سہارے ہی اب تک چلی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ لوگ جو کسی بنا پر دوم یا سوم درجے کے یا اس سے بھی کمتر قرار دیے گئے تھے اُن کا بھی ایک بامعنی اور فعال وجود ہوتا ہے۔ وہ ہماری تاریخ پر ایسے گہرے نقش چھوڑ جاتے ہیں کہ مٹائے نہیں جا سکتے خواہ ہماری کم نظری اُنھیں آنکھ سے اوجھل رکھے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

مومن اور ان کے نقاد

مومن اپنے عہد کے۔ جسے شاہجہاں آباد دہلی کا نیو کلاسیکی دور کہنا چاہیے ، ایک ممتاز شاعر اور صاحب کمال شخص تھے ۔ اس نسبت سے ان کی زندگی ہی میں ان کے بارے میں تقریظ و تنقید کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا جس میں خصوصیت سے اُن کی نغزگوئی کو سراہا جاتا رہا۔

ان کے معاصرین میں کچھ ان کے دوست ہیں کچھ مداح ہیں کچھ معترف ہیں اور کچھ مخالف۔ اس آخری زمرے میں حکیم قطب الدین باطن کو شامل کیا جا سکتا ہے جو مومن کے محض اس لیے مخالف تھے کہ وہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے دوست اور ان کے شاگرد تھے اور باطن نے اپنا تذکرہ گلستان بے خزاں شیفتہ کے تذکرے گلشن بے خار کے جواب میں تالیف کیا تھا ۔

ذوق و غالب اور شیفتہ کے ماسوا مومن کے شریک عصر عالموں ادیبوں اور شاعروں میں مفتی صدرالدین خاں آزردہ ، مولوی کریم الدین ، مولوی امام بخش صہبائی ، سرسید اور مرزا قادر بخش صابر جیسے تذکرہ نگار اور ادبی مورخ آتے ہیں ۔ بعد ازاں اس سلسلہ میں نواب امداد امام اثر ، نواب صدیق حسن خاں اور بالخصوص مولوی الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد جیسے نابغے شامل ہوجاتے ہیں ۔

شیفتہ بگمان غالب ان کے پہلے ترجمہ نگار ہیں جنھوں نے اُن کی تعریف کرتے

ہوئے انہیں دریائے معانی کا گوہر یک دانہ معدن سخن دانی کا لعل بے بہا بیان و بدیع کا صورت گر، شاعر حکمت پرور اور حکیم سخن گستر لکھا ہے اسی کے ساتھ اس طرف اشارہ کیا ہے کہ مومن کسی محرک کی تحریک کے بغیر فکر سخن کی طرف مایل نہیں ہوتے اور ان کا اکثر کلام میری (شیفتہ کی) خواہش و فرمایش پر معرض تحریر میں آیا ہے اور ان کے اشعار کی تدوین کا باعث بھی یہی فقیر (شیفتہ) ہوا ہے اب نظم ریختہ کی طرف توجہ کم ہے اور اکثر زبان دری میں سخن سنجی و سحر آفرینی کی داد دیتے ہیں۔

مومن کے فکر سخن، فارسی سے رغبت اور ان کے کلام کی جمع آوری کے سلسلہ میں یہ باتیں ان کے ایک سوانحی نقاد اور ان کے کلام کے مرتب کے لیے غیر معمولی طور پر اہم ہیں۔ شیفتہ نے اُن کی محبوبہ دلنواز صاحب جی کے ترجمے میں مومن کی حیات معاشقہ کی طرف چشم سخن سے اشارہ کر کے ان کے سوانح و سیرت اور فکر و فن کے مطالعہ میں ایک نئے موضوع باب سخن کا اضافہ کر دیا ہے۔

(ترجمہ) اس کا نام امت الفاطمہ بیگم ہے اور وہ صاحب جی کے عرف کے ساتھ معروف ہے وہ آفتاب کی طرح مشرق سے مغرب کی طرف آئی علاج معالجہ کے سلسلہ میں مومن خاں سے سابقہ ہوا کچھ دنوں درد دوا سے تعلق رہا اب کئی سال گزرے کہ پھر لکھنو واپس چلی گئی۔

مثنوی قول غمیں کہ مومن خاں کی تالیف ہے اُسی موزوں قامت کے نسخہ جمال کی شرح ہے۔ انھیں کے فیض صحبت سے یہ خاتون شعر و شاعری کی طرف مایل ہوئی اور موزونی قامت سے موزونی طبع کی طرف آ گئی اور آرایش زلف پریشاں کو چھوڑ کر اس نے موشگافی اشعار شروع کر دی[1]۔

سرسید نے مومن کے ذکر میں اس واردۂ جمیل کی طرف تو کوئی اشارہ نہیں کیا مگر مولوی

---

[1] گلشن بے خار۔

کریم الدین نے نہ صرف یہ کہ اس کا ذکر کیا بلکہ یہ بھی لکھ دیا کہ وہ ایک خانگی تھی جو بے حد اہم بات ہے۔

مومن کی مثنویاں ان کی حیات معاشقہ کی ادبی دستاویزیں ہیں جن میں صاحب جی کے افسانۂ عشق کے ماسوا بعض دوسری پردہ نشینوں کا بھی ذکر آتا ہے ___ یہ موضوع ان کے نقادوں اور سوانح نگاروں کے لیے زمانۂ مابعد میں بالخصوص ایک مرکزی نقطۂ فکر اور انتقادی زاویۂ نگاہ بنا رہا ہے خاص طور پر اس لیے کہ مومن کی تمام غزلیہ شاعری عشق کی مادی تعبیرات اور مجازی تصورات کی پابند ہے جس پر ان کے نقادوں نے مخصوصاً بہت زور دیا ہے۔

سرسید نے ان کے کمال فن کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے دیوان ریختہ کے غزلیات سے لے کر تا مخمسات و مسدسات اور فردے لے کر تا رباعیات و قطعات اصناف سخن اور شعب فن پر مشتمل ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مومن کے "دیوان ریختہ" میں سے صرف سولہ اور اس کے مقابلہ میں دیوان دری سے چھیالیس شعر نقل کیے ہیں جس سے فارسی کے لیے ترجیحی رویہ کا پتہ چلتا ہے اسی کے ساتھ حکیم احسن اللہ خاں کے نام ایک ایسا طویل فارسی خط بھی درج کیا ہے جس میں فن طب کی بہت سی اصطلاحات تسبیح ہزار دانہ کی طرح ایک ہی رشتۂ تحریر میں پروئی ہوئی ہیں۔

اس انداز پیش کش سے اس ادبی نقطۂ نظر کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے جس کے ساتھ مومن کے ہم عہد مصنفین نے ان کے کمال فن کا جائزہ لیا نیز یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ غالب کی طرح مومن بھی اردو کے مقابلہ میں فارسی ادبیات کو اپنے فکر و فن عیار گیری کا زیادہ صحیح پیمانہ تصور کرتے تھے۔

مرزا قادر بخش صابر کے یہاں سوانحی اشارے نسبتاً زیادہ ہیں اس ضمن میں انھوں نے مومن کی سیرت کے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ وہ بے حد انانیت پسند ہیں اور اپنے مقابلہ میں کسی دوسرے کو خاطر میں نہیں لاتے اور اپنے مقابلہ

میں متاخرین و متقدمین سب ہی کو کم معیار و بے اعتبار تصور کرتے ہیں۔

"یہ والا نگاہ اپنی ہمت عالی کے اوج سے سب کے احوال پر نگاہ کرتا تھا ہر بلند اس کو پست اور ہر بزرگ خرد نظر آتا تھا اور وہ بے تصنع اس کا نام اسی پندار کے ساتھ زبان پر لاتا تھا۔ کوتاہ بینان روزگار اس علوئے ہمت سے آگاہ نہ تھے اس کی نگاہ کو عیب بیں اور اس کی زبان کو خردہ گیر خیال کرتے تھے۔"

یہ بات محض کسی معاصرانہ چشمک یا ذاتی اختلاف کے زیر اثر زبان قلم پر نہیں آئی اس کے واضح شواہد بھی موجود ہیں۔ مولانا آزاد نے آب حیات میں لطیفہ کے عنوان سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کی عالی دماغی اور بلند خیالی شعرائے متقدمین و متاخرین میں سے کسی کی فصاحت و بلاغت کو خاطر میں نہ لاتی تھی، یہ قول ان کا مشہور تھا کہ گلستان سعدی کی تعریف میں لوگوں کے دم چڑھے جاتے ہیں اس میں ہے کیا گفت گفتہ اند کہتا چلا جاتا ہے اگر ان لفظوں کو کاٹ دو تو کچھ بھی نہیں رہتا[۱]۔"

مومن کے حد درجہ معتقد و مداح عرش گیاوی نے بھی مومن کے اس رویہ پر روشنی ڈالی ہے اور بعض دوسرے ایسے کوائف کی طرف اشارے کیے ہیں جو مومن کی اس "انانیت" کے غماز ہیں جعفر علی خاں اثر مومن کے اس ذہنی رویہ کو ان کی ادبی خودداری و خودشناسی پر محمول کرتے ہیں لیکن بالآخر ان کی زبان پر بھی یہ فقرے آجاتے ہیں۔

"وہ اپنے معاصرین کو شاعر ہی نہیں سمجھتے تھے بارہا انھوں نے ان کو "سگان جیفہ خوار" لکھا ہے وہ ذوق و غالب کو اپنے مد مقابل ٹھہرانا گوارا نہیں کرتے تھے[۲]۔"

۱؎ آب حیات: ۲؎ نگار مومن نمبر: ۵۸

مومن کے ادبی مطالعہ فنی تجزیہ میں ان کے شخصی کردار اور ادبی مزاج کی اس انانیت کو بعد کے اکثر ناقدین نے اُن کی خودداری اور احترام فن سے تعبیر کیا ہے، اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی عہد آفریں تصنیف آب حیات کے پہلے ایڈیشن میں مومن کا ترجمہ شامل نہیں کیا تھا اس پر بہت لے دے ہوئی، دوسرے ایڈیشن میں یہ ترجمہ شامل ہوا، تو مولانا نے یہ عذر کیا کہ وہ ضروری معلومات فراہم نہ کر سکے تھے اور جن احباب کو انھوں نے خطوط لکھے انھوں نے اس بارۂ خاص میں اُن کی کوئی مدد نہ کی یہ عذر اس حد تک توضیح اور قابلِ قبول ہو سکتا ہے کہ حالات کی فراہمی میں یہ دشواریاں موجود تھیں خود عرش گیاوی کو بھی یہ دشواریاں پیش آئیں۔ لیکن مولانا نے جن الفاظ میں یہ معذرت پیش کی وہ لائق توجہ ہیں۔

"وجہ یہ تھی کہ دور پنجم جس سے ان کا تعلق ہے بلکہ سوم و چہارم کو بھی اہل نظر دیکھیں کہ جو اہلِ کمال اس میں بیٹھے ہیں کس لباس اور سامان کے ساتھ ہیں کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جب ہی زیب دیتا ہے کہ اسی سامان و شان اور وضع ولباس کے ساتھ ہو۔ جو اہلِ محفل کے لیے خاص ہے نہ ہو تو ناموزوں معلوم ہوتا ہے[1]"

اس بیان کی اسپرٹ یہ ہے کہ مومن اس درجہ کے فنکار نہیں کہ وہ اس محفل میں جگہ پاسکتے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس دوسرے ایڈیشن میں جو حالات مولانا نے درج فرمائے وہ کسی دوست نے اُن کو لکھ کر بھیجے تھے جنھیں معمولی سی قطع و برید کے ساتھ انھوں نے آب حیات میں شامل کر دیا یہ دوست مولانا الطاف حسین حالی تھے حذف و اضافہ کی صحیح نوعیت کیا تھی اب یہ بتانا مشکل ہے۔

اس ضمن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مولانا نے مومن کے حالات اس لیے نہیں لکھے

---

[1] آب حیات

کہ ان کی محبوبہ دلنواز مولانا کی اپنی کوئی عزیزہ تھیں ممکن ہے ایسا ہو لیکن مولانا کے لیے تسوید حالات میں اس پہلو کو نظر انداز کر دینا ایسی کون سی ناممکن بات تھی جو مولانا آزاد نہیں کر سکتے تھے۔

مولانا آزاد کے ذہنی تحفظ کی جو بھی وجہ رہی ہو یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے مومن کے کلام پر جو رائے سپرد قلم کی وہ بڑی حد تک آزادانہ و معترفانہ ہے اور بظاہر اس میں ان کے تعصب و تفاخر کو کوئی دخل نہیں اور اُسے مومن کے بارہ میں اُن کی کم نظری و کم معیاری پر محمول کرنا مشکل ہے۔

"ان کے خیالات نازک اور مضامین عالی ہیں اور استعارے و تشبیہ کے زور سے اور بھی اعلا درجہ پہنچایا ہے ان میں معاملات عاشقانہ عجب مزے سے ادا کیے ہیں اس واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے اس کا انداز جرأت سے ملتا ہے اور اس پر وہ خود بھی نازاں تھے"

فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور دلکش تراشے ہیں کہ اردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں۔ اُن کی زبان میں چند وصف خاص ہیں جن کا جتانا وصف سے خالی نہیں۔ وہ ایک شے کو کسی خاص صفت کے لحاظ سے ذات شے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجیب لطف لطیف اور معنی پنہانی پیدا کرتے ہیں"[۱]

آزاد کے اس بیان میں کلاسیکی انداز نظر اور عصری میلانات کے اعتبار سے ایسی کوئی بات موجود نہیں جس کی وجہ سے مومن سے حسن عقیدت رکھنے والے آزاد کے خلاف ایک خاص طرح کا ادبی تعصب اختیار کر لیں اور اس کا اثر ذوق سے متعلق اُن کی ادبی تنقیدوں پر بھی مرتب ہو مگر ایسا ہوا ہے اور عرش گیاوی نے تو آزاد کی مخالفت میں ذوق کی تضحیک میں بھی کوئی تکلف نہیں کیا۔ اور ان کی شاعری پر "عطر مجموعہ" کی پھبتی کسی۔

---

[۱] آب حیات : ۴۴۲

مومن کے ناقدانہ مطالعہ اور تنقیدی تجزیہ میں آزاد کے بلیغ اشارے کام آسکتے ہیں لیکن تنقید کے عصری تقاضوں اور عہد حاضر کی انتقادی قدروں کے نکتہ نکتہ کا حق تو بہر حال اس میں ادا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

آزاد کے بعد مومن پر جو کام ہوا اس میں "حیات مومن" مصنفہ عرش گیاوی ایک ضمنی کڑی کے طور پر سامنے آتی ہے۔ عرش گیاوی کے طرز نگارش پر اختلافی رویہ کے باوصف آزاد کی پرچھائیاں کافی دور تک اور دیر تک اپنا اثر ڈالتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے "تاج الکلام" کے عنوان سے روح مومن کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ گویا آزاد کے قلم کے سایہ میں لکھی ہوئی عبارت ہے۔

ان کا بڑا کارنامہ مومن کی اس تصویر کی دریافت ہے جس سے آج اہل ادب کی آنکھیں روشن ہیں اسی کے ساتھ انھوں نے مومن کی مثنویات سے ان کے حالات حیات کو بھی اخذ کرنے کی کوشش کی اگرچہ اس کے دوران وہ ایک سوانح نگار کے طور پر بہت غیر سنجیدہ ہوگئے اور اُنے عشق کا ڈرامہ "اور عشق کا تھیٹر" کہنے میں بھی تکلف نہیں کیا، مومن کے تلامذہ اور ان کی بعض غیر مطبوعہ تالیفات کا بھی انھوں نے کچھ حال لکھا، یہ اب دستیاب نہیں اُن کی رشتہ داریاں بھی اس میں موضوع گفتگو بنی ہیں اپنی بعض نمایاں خامیوں کے باوجود عرش گیاوی کی یہ مخلصانہ ادبی کاوش مومن شناسی کی ایک نئی ادبی تحریک کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔

مومن پر اس نئے دور میں جو کام ہوا اس کی شروعات مولانا ضیا احمد بدایونی مرحوم سے ہوتی ہے جو مومن کے اولیں شرح نگاروں میں سے ہیں یہ ایک عجیب بات ہے کہ مولانا کے علاوہ مومن کے بعض دوسرے نقاد بھی جن میں مولانا نیاز فتحپوری اور جعفر علی خاں اثر جیسے اہل زبان و ادب کے نام آتے ہیں دراصل مومن کے شرح نگار ہی ہیں اس کا اندازہ نگار کے مومن نمبر کے مطالعہ سے بھی ہوتا ہے۔

اسی نمبر میں نیاز صاحب کا یہ مشہور مقولہ سامنے آتا ہے جس کی حیثیت ایک قول محال کی سی ہے۔

اگر میرے سامنے تمام شعرا کا کلام رکھ دیا جائے اور صرف ایک کے انتخاب کی اجازت دی جائے تو میں بلاتامل کلیات مومن اٹھا لوں گا۔

اپنے اس مضمون میں علامہ نے جو کچھ لکھا ہے اُسے یہاں مختصر اً پیش کیا جاتا ہے :

"مومن کا ماحول بھی وہی تھا جو غالب و ذوق کا تھا سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ ستارۂ سحری کی طرح جھلملا رہا تھا اور شعرائے عصر اسی کو غنیمت جان کر حریصانہ انداز کے ساتھ ... ہاتھ پیر مار رہے تھے۔"[1]

اس سلسلہ میں ذوق کے لیے تو علامہ نے یہاں تک لکھ دیا کہ وہ دونوں ہاتھوں بے چارے ظفر کو لوٹ رہے تھے۔ ایک ذمہ دار نقاد کی یہ غیر ذمہ دارانہ رائے ہر طرح کے تنقید و تبصرے سے بے نیاز ہے۔

ڈاکٹر رضی الدین نے انکے شعور و شعر پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے مضمون میں بعض فکر انگیز باتیں کہی ہیں جن سے سرسری گزرنا کلام مومن کا سنجیدہ مطالعہ کرنے والوں کے لیے شاید مناسب نہ ہوگا۔

مومن کی شخصیت اور شاعری میں اُن کی سب سے بڑی خوبی سب سے بڑی خامی ہے اُن کی شگفتگی و رنگینی کا یہ ساز محض محبت کا ساز ہی رہا مومن کا سوز نہ بن سکا۔ نقادوں کا یہ فرمانا کہ ان کا محبوب پردہ نشیں تھا یا اُن کی شاعری میں ارزانی اور محبت کے جذبات میں عریانی تھی۔ اُنکی شاعری کا معما اور تعقب کا ملمع بے شخصیت کا عکس نہیں اُن کی شاعری کا مرکزی نقطہ اُن کی شخصیت کا اعتدال ہے جس نے اُن کی شاعری کو چاہے ابتذال سے بچا لیا ہو مگر اُسے بے پناہ شعریت سے محروم کر دیا ـــ ان کے زمانہ میں ذہن

[1] نگار نمبر : ۳

اور زندگی میں کتنی کشمکش رہی ہو مگر غم یہ ہے کہ اُن کی شاعری اس
کشمکش سے تہی دامن رہی"۔ (ص ۶۹-۱۶۸ یادگارِ مومن)

سچ یہ ہے کہ مومن نے اپنے اشعار کی فکری ساخت اور فنی شناخت کے طور پر ان کے اپنے تعمیریِ حسن کی صورت میں بہت سی نظری بھول بھلیاں پیدا کیں مگر بادی حسن و عشق کا شاعر ہوتے ہوئے بھی اپنے احساس جمال کا کوئی تاج محل تخلیق نہیں کر سکے۔
مومن کے شاعرانہ کردار پر روشنی "ڈالتے ہوئے علامہ نیاز فتحپوری نے لکھا ہے:

"پہلی چیز جو مومن کو ان کے عہد کے دوسرے شعراسے ممتاز کرتی ہے
یہ ہے کہ ان کے کلام سے خوے گدایانہ کا اظہار نہیں ہوتا"۔[ا]

اس سے مراد مومن کی خودداری ہے اور روئے سخن ان شعرا کی طرف ہے جو دربار سے وابستہ رہے یا جنھوں نے امرائے وقت کے لیے قصیدے لکھے۔

درباروں سے وابستہ صرف اہلِ سخن ہی نہیں رہے بڑے بڑے اہل کمال اور ارباب ہنر بھی درباروں کی طرف سے نوازے جاتے رہے ہیں یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ قصیدے کبھی بھی بے علم اور کم سواد لوگوں نے نہیں لکھے قصیدہ لکھنے والے کے لیے مروجہ علوم سے واقفیت فنون شعریہ پر قدرت زبان کے بڑے حصہ پر دسترس اور اسی کے ساتھ جزالت فکر ضروری تھی اور دربار کی طرف سے ایسے اہل کمال کی سرپرستی وجہ عزت ہوتی تھی ہیچ مقداری اور دریوزہ گری کی کوئی صورت نہیں۔

حالی نے کچھ خاص حالات اور مقاصد شعر گوئی کے زیر اثر قصیدہ نگاری اور قصیدہ نگاروں پر جو رائے زنی کی تھی وہ اِدھر سے اُدھر تک ہمارے تنقید نگاروں کے ذہن کو متاثر کرتی چلی گئی اور اسی کے ساتھ عہد ماضی کے تاریخی تقاضے اور تہذیبی تلازمے نظر انداز کیے جاتے رہے حقیقت یہ ہے کہ مومن اور بعض دوسرے شاعروں پر ناقدانہ

ا۔ نگار مومن نمبر؛

نظر ڈالتے ہوئے ہمارے بعض اہل ادب اور ناقدین نے جو کچھ لکھا ہے ادب وثقافت کے سیاق وسباق سے اس کا رشتہ بہت کمزور پڑ گیا ہے جس کا آمد سخن میں انھیں احساس تک نہیں ہوتا۔ آگے چل کر علامہ نے لکھا ہے۔

"رنگ تغزل میں ان کا کلام اس غیر متغزلانہ چیز سے بالکل پاک ہے جسے تصوف یا عشق حقیقی سے تعبیر کیا جاتا ہے ـــــ اگر ایک نقاد غزل کو غزل ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھے گا تو وہ یوں بھی تصوف کے کلام کو خارج کر دے گا چونکہ غزل کے اندر ایسی باتوں کا اظہار جو تغزل سے علیحدہ ہوں میرے نزدیک کوئی محمود بات نہیں"۔

تغزل یا غزلیہ شاعری کی عیارگیری کا یہ پیمانہ جو مومن کے رنگ تغزل کی تحسین کے لیے تراشا گیا ہے غزل کی تخلیق اور تہذیبی فضا کی تفہیم کے لیے کیا واقعتاً کوئی موزوں طریقہ ہو سکتا ہے علامہ نے پسندیدگی اور ترجیح کا حق ہی نہیں اخراج کا حق بھی اپنے لیے محفوظ کر لیا اور آگے چل کر لکھا۔

"میرے نزدیک تغزل میں تصوف کو شامل کر لینا ایک غزل گو شاعر کا کمال نہیں بلکہ اس کا عجز ہے"۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن شعرا نے تصوف کو اپنی غزل سے "عجز شاعرانہ" سمجھ کر خارج کر دیا کیا درحقیقت وہ غزل گوئی کا کوئی اعلا معیار قائم کر سکے اور کیا مومن کی غزلیہ شاعری کے ایک بہت بڑے حصہ کے لیے ایسا لکھنا ممکن ہے؟ متصوفانہ عناصر کو غزل سے خارج کر کے جو متغزلانہ معیار پیش کیا گیا ہے وہ خود کیا ہے مومن کی شاعری کا وہ حصہ جو خالص مادی اور مجازی عشق کی واردات اور کوائف پر مشتمل ہے کیا اردو اور فارسی کی بڑی شاعری کے مقابلہ میں اُسے بے تکلف پیش کیا جا سکتا ہے؟

مومن کی اپنی متغزلانہ شاعری کے پس منظر کے بارہ میں نیاز صاحب کی یہ رائے بھی قابل توجہ ہے:

مومن نے اسی دُنیا کا عشق کیا اور اس میں جتنے تجربات تلخ وشیریں

ہو سکتے ہیں وہ سب انھوں نے کیے، وہی ہجر و وصال کی مادی کیفیات؛ وہی شکوہ شکایت، وہی رقیب کا کھٹکا، وہی التجائیں وہی تدبیریں جو مادی محبت سے تعلق رکھتی ہیں سب مومن کے یہاں پائی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اگر ہم معشوق کا کردار کلام مومن سے متعین کریں تو کہہ سکتے ہیں وہ بازاری جنس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا با ایں ہمہ مومن کا کمال شاعری دیکھیے کہ ایک طرف وہ پستی سے اس قدر قریب ہے کہ ایک ادنا لغزش بھی اُسے گرا کر جرات و انشا کی صف میں ملا سکتی ہے۔ یہ تو پستیوں کی بات تھی جن کے محرکات کہیں اور نہیں خود مومن کی شاعری میں موجود تھے۔

مومن کی فکری بلندیوں کے سلسلہ میں اس کا اظہار اور اقرار خود نیاز صاحب نے کر لیا ہے کہ وہ اسی محدود دائرے سے تعلق رکھتی تھیں جو مومن کے رنگ تغزل سے عبارت ہے اور جس کا تعلق جنس اور جذبہ کی شاعری سے ہے۔

اس نوع کی شاعری میں بڑی شاعری کے امکانات موجود ہوتے ہیں سنسکرت اور پراکرتوں کی شعری تخلیقات میں اس کے نقوش جمیل موجود ہیں اسی شاعری کو فطرت سے اس کے گہرے رشتوں اور جمال پرستانہ احساسات کی وجہ سے فکر انگیز اور حسن آفریں شاعری قرار دیا جانا ممکن ہے مگر ایسے نمونے مومن کے یہاں بہت کم ہیں اس کی بڑی وجہ حال و خیال کا وہ تنگ حصار ہے جو جگہ جگہ فکر کی گرہ بندیوں کا طلسم بن کر رہ گیا ہے۔

مولانا ضیا احمد بدایونی نے مومن کو اردو غزل کا سادہ کار کہا ہے یہاں سادہ کاری اس شاعرانہ ہنرمندی سے عبارت ہے جو صنعت و حرفت کے اعتبار سے کمال فن کی نشان دہی کرتی ہے، جذبہ کی صحت اور تجربے کی صداقت سے اس کا واسطہ دور کا ہے۔ مومن کو یوں بھی سادہ کاری و صناعی سے گہری دلچسپی تھی اس پر مستزاد اُن کی بازی شطرنج اور علم نجوم سے خصوصی شغف اور ایک محدود دائرۂ فکر و خیال میں رہتے ہوئے خود کو دُہرانے کے عمل سے بچنے کی شعوری کوشش اس نے مومن کو تخیل پرست بنا دیا۔ جس کی وجہ

سے وہ محسوس نہیں کرتے سوچتے ہیں اور محو تماشائے دماغ رہ کر تخیلی انداز نظر کے ساتھ ایسے شعری مرقع سجانا اور لفظی پیکر تراشنا چاہتے ہیں جو صورت بلیغ خیالی اور ہیئت میں مثالی نظر آتے ہیں۔

وہ فارسی شاعری اور اس کی ادبی نثر کی اس روایت سے گہرے طور پر متاثر ہیں جو ظہوری و بیدل کی روایت کی صورت میں ان کے عہد تک پہنچی تھی اسی روایت کی کسوٹی پر مومن اور ان کے بعض معاصرین کے شعری آرٹ اور نثری اسلوب کو پرکھا جائے یہ زیادہ بہتر ہے۔

دھنک جیسے کچھ رنگ اُن کی شاعری میں ضرور مل جاتے ہیں مگر افق سے تا بہ افق پھیلی ہوئی قوس قزح کی ہمہ گیری اور وسعت ان کے یہاں نہیں۔ ان کی غزلوں سے کچھ زیادہ تو ان کے قصیدوں سے وسعت کا اظہار ہوتا ہے اور اسی نسبت سے وہاں پیچیدگی بھی کچھ کم ہے ۔۔۔

ان کے یہاں ذہن کی روشن و شفاف فضا کی وسعتوں کے مقابلہ میں نیرنگیوں اور پیچیدہ ذہنی رویوں کا جو دیرپا اثر ملتا ہے اسی نے اُن کی شاعری میں ابہام پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے بعض ممتاز نقاد دراصل ان کے شرح نگار ہیں۔ مومن کی شرح نگاری میں بعض اوقات ان کے شارحین کے ذہن کو اُن کی زبانِ قلم کے ساتھ کن آزمائشوں سے گزرنا پڑا اس کا اندازہ مولوی ضیا احمد بدایونی کے اس بیان سے ہوتا ہے۔

> "اکثر اشعار کی تحقیق میں بحث و تمحیص اور غور و فکر کی بیشمار قیمتی گھڑیاں صرف کی ہیں تب کہیں "یہ تراوش خونابہ" ظہور میں آئی ہے اسی کے ساتھ اس کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ بعض مقامات پر شاعر کے مفہوم کی تہ تک پہنچنے میں شاید خود میں بھی کامیاب نہ ہو سکا ہوں۔"[1]

---

[1] دیوان مومن مع شرح : ۶

اس صورت حال کی توجیہ شاعر کی بلندی فکر کے حوالہ سے نہیں معمیاتی فکر کی گرہ کشائی سے ممکن ہے۔

انھوں نے خیالات کی بلندی اور پیچیدگی پر اتنا زور طبع صرف کیا کہ خود زبان شعر کا حسن اور طرز ادا کا لطف باقی نہ رہا۔ ان کے ایک شارح جعفر علی خاں اثر نے لکھا ہے

> "انھوں نے شاعری کو فن کی حیثیت سے کبھی اختیار نہیں کیا اور اخلاق کی تہ میں خیالات کی پیچیدگی اور زبان کی ناہمواری دو خاص عنصر ہیں ـــ اس بات کو ان کے رتبہ سے فروتر سمجھیے یا بالاتر، مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ خود اس معاملہ میں غالب سے بھی زیادہ بدنام ہیں اور بجا طور پر بدنام ہیں" [۱]

مومن کی بدیع الاسلوبی کا ذکر ان کے قریب قریب سبھی نقادوں نے اپنے اپنے انداز اور اسلوب سے کیا ہے لیکن نیاز صاحب نے بات کو آگے بڑھا کر یہاں تک پہنچا دیا۔

> "غالب نے بیدل کو سامنے رکھ کر فارسی ترکیبیں استعمال کیں لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ اس کی تحریک پیدا ہوئی مومن کے کلام کو دیکھ کر۔" [۲]

اس اتنے بڑے دعوے کے لیے نیاز صاحب نے کوئی روشن دلیل پیش نہیں کی اور جن اشعار سے اس کی وضاحت کی ان کے بارہ میں تحقیق سے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ وہ مومن نے پہلے کہے اور غالب نے تقلید بعد میں کی۔

مومن کی شاعرانہ خودداری اور دائرہ فکر و خیال کی انفرادیت کے ضمن میں اُن کے مذہبی معتقدات، بیعت جہاد اور مذہبی قصائد کا ذکر خصوصیت کے ساتھ آتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں مذہبی مسایل و معاملات میں وہ ایک خاص نقطہ نظر رکھتے ہیں اور اس میں ان کے یہاں ایک گونہ شدت ہے لیکن اس کا اثر اُن کی شاعری پر اتنا گہرا اور دیرپا نہیں ہے جتنا سوچا جاتا ہے انھوں نے صحابہ کبار کے لیے جو قصیدے

---

[۱] نگار مومن نمبر: ٦ ۔ [۲] ایضاً : ٧

انشا کیے ہیں ان کا موضوع مذہبی ہے اُن کی فضا نہیں حضرت ابو بکر صدیق حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی کے کرداروں کی انفرادیت ان کا موضوع فکر نہیں بنا صرف ان کی عظمت کا روایتی تصور ان سے شعر کہلواتا رہا اگر معمولی تبدیلیوں کے ساتھ نام بدل دیے جائیں تو یہ قصیدے کسی بھی دوسرے بڑے شخص کے لیے ہو سکتے ہیں قصیدہ نگاری کے سلسلہ میں یہ دقت خود سودا کو بھی پیش آئی تھی ــــــ

مومن عنوان اور سرنامہ کی حد تک تو مذہبی انداز نظر اور جوش عقیدت کے زیر اثر رہتے ہیں اس کے بعد جو تخیل سطح اور تخلیقی فکر ان کے قصائد میں ملتی ہے وہ بیشتر صورتوں میں قصیدہ کی کلاسیکی روایت سے وابستہ ہو جاتی ہے ان کے مذہبی عقائد کی گرفت میں نہیں رہتی۔

وہ حضرت سید احمد بریلوی شہید بالاکوٹ سے بیعت جہاد کرتے ہیں مثنوی جہادیہ لکھتے ہیں سید اسماعیل شہید سے غیر معمولی عقیدت رکھتے ہیں ان کے اشعار میں بھی گاہ گاہ مذہبی مصطلحات اور اہل بدعت کے خلاف ان کا ذہنی رویہ سامنے آتا ہے مگر اس سے وجدانی شعور اور والہانہ تخلیقی جذبہ اور مذہبی حیثیت کا پتہ نہیں چلتا جس کی وجہ سے شیخ اکرام نے انہیں ملی شاعری کی روایت سے جوڑ دیا ہے مذہبیت تو ہمارے بہت سے شعرا کی تہذیبی اور تخلیقی کا جزو ہے لیکن کوئی ایسا جزو نہیں جو اپنے کل کی طرح ہو۔

مومن کی شاعری کا جائزہ لینے والوں میں ہمارے بہت آج کے معروف اور غیر معروف نقاد شامل ہیں نگار کے مومن نمبر کے ماسوا پیام وطن اور مجلس یادگار مومن کے مقالہ نگاروں کی ایک اچھی خاصی طویل فہرست ہے بعض اہل علم او اصحاب تالیف نے انہیں مستقل طور پر موضوع ذکر و فکر بنایا ڈاکٹر عبادت بریلوی کلب علی خاں فائق اور ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کی تصانیف مومن اور مطالعہ مومن کے سلسلہ اپنے اپنے دائرہ میں قابل قدر تصنیفی کارنامے ہیں ظہیر صاحب نے زیادہ جامع کتاب مرتب کی اور مختلف مباحث کو سمیٹنے کی قابل تحسین ادبی کاوش کی ہے۔

مولنا ضیا احمد بدایونی کی طرح حامد حسن قادری صاحب نے مومن کے منتخب کلام کی شرح کی ہے اور اس ضمن میں مومن کے فکر اور فن سے تعلق تنقیدی نکتے بھی بیان

کیے ہیں۔

ان تنقیدی شرحات کی بدولت کلام مومن کی معنیاتی سطح پر بازیافت ممکن ہوگئی ہے لیکن نئے دور کے لیے مومن کی معنوی بازیافت کا مسئلہ ہنوز ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

مومن کے ایک بڑے نقاد ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ مومن کی عشقیہ مثنویات سے استفادہ کرتے وقت اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ وہ شاعرانہ افسانہ طرازیوں اور خیال آرائیوں سے مبّرا نہیں جو یقیناً ایک اہم بات ہے۔ ان کے ایک نقاد عالم خوندمیری نے مغربی انداز نظر کے ساتھ اُن کی شاعری پر کچھ اس طرح گفتگو کی ہے کہ مومن کے شاعرانہ کردار کے وہ پہلو بھی بے حد حسین ہوگئے جو دوسروں کے نزدیک بہت کمزور رہیں۔

"جنسی محبت کو جو چیز قدر عطا کرتی ہے اور جس کی وجہ سے محبت انسانی زندگی کا ایک محدود تجربہ ہوتے ہوئے کبھی اعلا ترلامحدود تجربات کی جانب رہنمائی کرتی ہے وہ "وفا" ہے مومن کی شاعری میں وفا کا عنصر اتنا موثر ہے کہ اُن کی عشقیہ شاعری دنیا کی عشقیہ شاعری کا بہترین جزو بن گئی ہے۔
(یادگار مومن : ۴۶)

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا
لے شب وصل غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

اس شعر میں افسردگی کی فضا ایک عجیب شعری منظر فراہم کرتی ہے جو حقیقی جذبات کے بغیر ممکن نہیں میرا خیال ہے کہ یہ مومن کے انتہائی مستند شعروں میں سے ایک ہے۔" (۴۸)

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

مومن کا ان کے تلامذہ پر اثر

انیسویں صدی کی شاعری جن ہستیوں سے عبارت ہے ان میں سب سے نمایاں نام غالب، مومن اور ذوق کا ہے۔ یہ تینوں صرف اپنے عہد ہی کے بڑے شاعر نہیں تھے بلکہ انھوں نے اپنے بعد بھی ایسا اثر چھوڑا کہ آج بھی اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تینوں میں سب سے مضبوط گرفت غالب کی ہے۔ یہ عہد غالب کا عہد ہے مگر یہ بات بھی اہم ہے کہ غالب جیسی دیوپیکر شخصیت کے سامنے اگر کوئی شاعر اپنی عظمت منوا لے تو یہ اس کی بڑائی کی سند کے لیے کافی ہے اور مومن کی شاعری کا اعتراف اس عہد کے ہر تذکرہ نویس نے کیا ہے۔ غالب کے دیوان نذر کر دینے کا واقعہ خواہ کتنا ہی مبالغہ آمیز کیوں نہ ہو مگر اس مبالغے کے پیچھے جو حقیقت اور اعتراف ہے وہ شاید اہل نظر سے پوشیدہ نہ ہوگا۔

مومن کی عظمت کی تلاش کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ان کے کلام کا تجزیہ کیا جائے کہ اساتذہ فن کی کس صف میں ان کو کھڑا کیا جا سکتا ہے اور دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کے تلامذہ کے مرتبے کا تعین کیا جائے۔ مرتبے کے تعین کے ساتھ اس بات پر بھی غور کرنا ہوگا کہ انھوں نے رنگِ مومن کو کس طرح قبول کیا ہے۔ یہاں شاید یہ بتانا بے محل نہ ہو کہ مومن کے تلامذہ اس مرتبے کے لوگ تھے کہ ان کی عظمت کا اعتراف

ہر دور میں کیا گیا ہے۔ نواب اکبر علی خاں برادر نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں۔

"ہر بیت ان کے مضمونِ رنگیں سے دکان گل فروش ..... لطف سخن سے خط خوباں خجل اور خوبی سطور سے سنبلِ جنت منفعل"[۱]

خود مصطفےٰ خاں شیفتہ کے لیے غالب کی یہ سند

غالب ز حسرتی چہ سرائی کہ در غزل چوں او تلاش معنی و مضمون نکردہ کس

کسی گلدستہ میں غالب نے نسیم دہلوی کی غزل پڑھی تو نول کشور سے ان کے مزید حالات اور کلام منگوایا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "کہربا جستم و عقیق یافتم"[۲]

حسرت شاعر ہی نہیں بلکہ شعر کے نبض شناس بھی تھے۔ انھوں نے نسیم کی شاعری کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"لکھنؤ کے بیان اور دہلی کی پسندیدہ اور معتدل ترکیب کا جیسا جلوہ نسیم کی شاعری میں نظر آتا ہے اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتی"[۳]

نثار علی شہرت کے بارے میں یہ بتا دینا کافی ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ اس بات پر زور دیا کہ لاہور میں ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں علوم و فنون مفیدہ کا ترجمہ ہندوستانی زبانوں میں کیا جائے۔ انجمن حمایت اسلام انھی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

مومن خاں جب اپنے کسی شاگرد کو مشورۂ سخن کے لیے کہتے تو کہتے کہ میر حسین تسکین کے پاس جاؤ۔ یہ شرف میر حسین تسکین کو ہی حاصل تھا کہ مومن اور غالب کے بہت سے شاگردوں نے ان کی شاگردی اختیار کی۔

گلستان بے خزاں میں قطب الدین باطن نے مومن کے شاگردوں کا ذکر حقارت سے کیا ہے مگر

۱؎ آثار الصنادید

۲؎ دلی کا دبستان شاعری۔ غالب کے اس خط کا پتا نہ چل سکا جس میں یہ حوالہ ہے۔

۳؎ لکھنؤ کا دبستان شاعری

برق کی شاعری کا اعتراف ان کو بھی ہے۔

"برق کلام۔ کلام برق۔ مصرع ہے کہ شمشیر برق۔ برق کیا۔ برق میں اور اس میں سراسر فرق۔ شعر پڑھا کہ بجلی چمک گئی"[1]

ایک واقعہ سے ہمارے دعوے کو مزید تقویت ملے گی۔ رام پور کے ایک مشاعرہ کی صدارت صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا کر رہے تھے۔ تسلیم بھی اس مشاعرہ میں شریک تھے۔ جب شمع تسلیم کے پاس آئی تو انھوں نے اپنی غزل پڑھی۔

یادگار ہستی موہوم ہم رکھتے نہیں صورت عمر رواں نقش قدم رکھتے نہیں
ایک صورت پر بسر کرتے ہیں زیر آسماں صورتِ ماہِ دو ہفتہ بیش و کم رکھتے نہیں

تسلیم کا بیان ہے کہ انھوں نے جب مطلع پڑھا تو شہزادہ صاحب نے پیچوان چھوڑ دیا اور میری طرف مخاطب ہو گئے۔ غزل ختم کرنے کے بعد دریافت کیا کہ آپ کس کے شاگرد ہیں۔ میں نے کہا کہ اصغر علی خاں نسیم کا۔ فرمایا وہ کس کے شاگرد ہیں؟ میں نے کہا مومن خاں دہلوی کے۔ یہ سن کر خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں بھی تو کہتا ہوں کہ لکھنؤ والے اس رنگ میں کہنا کیا جانیں وہ تو انگیا کرتی کا مضمون خوب کہتے ہیں[2]۔

مومن کے کلام کی خصوصیات میں تغزل۔ نازک خیالی۔ تراکیب کی جدت۔ اور معاملہ بندی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مومن کی ان خصوصیات کو ان کے تلامذہ نے کس طرح اپنایا ہے۔ اسی کے ساتھ اہم بات یہ بھی ہے کہ کیا وہ محض تقلید کے دائرہ میں گھومتے رہے اور اپنے آپ کو محدود کر لیا یا اس میں کچھ نئے برگ و بار بھی پیدا کیے۔ یہاں یہ اشارہ بھی ضروری ہے کہ یہ تلامذۂ مومن ہی کا اثر تھا کہ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ ایک مرکز پر نظر آتے ہیں۔ مومن سے ہوتا ہوا جو سلسلہ نسیم، تسلیم اور حسرت تک پہنچتا ہے اس نے مضامین دہلی اور زبان لکھنؤ کا ایک ایسا خوب صورت امتزاج پیدا کر دیا جس کا اعتراف نہ کرنا ادبی دیانت داری کے خلاف ہوگا۔

---

[1] گلستان بے خزاں [2] انتخاب یادگار

اصل موضوع پر آنے سے پہلے چند امور کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ مومن کا حلقۂ تلامذہ محدود تھا۔ تذکروں کی مدد سے اس وقت تک جن تلامذہ کے نام دریافت ہو سکے ہیں ان کی تعداد چوالیس ہے[1]۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مومن نے اپنے معاصرین کے مقابلہ میں عمر کم پائی مگر اس سے زیادہ اس کا سبب ان کی آزاد مزاجی اور طنطنہ تھا جو لوگوں کو قریب آنے سے روکتا تھا۔ مگر اس کے باوجود یہ ایک عجیب بات ہے کہ بہت سے خوش گو شعرا نے مومن کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ ان کے مرنے کے بعد غالب کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہوئے مثلاً شیفتہ۔ ناظم۔ بیتاب۔ سالک۔ خورشید اور

لہ

آشفتہ	حکیم منور علی	سکندر	سکندر خاں	غنی	عبدالغنی
آہی	سید عبدالرحمٰن	سجو	منشی غلام محمد	قلق	مولا بخش
اصغر	اصغر علی خاں	شورش	غلام احمد	قیصر	مرزا احمد بخش
اکبر	اکبر علی خاں	شہرت	میر نثار علی	کاظم	کاظم علی
برق	قاضی نجم الدین	شیدا	میر محبوب خاں	کرم	غلام ضامن
بیتاب	عباس علی خاں	شیفتہ	مصطفےٰ خاں	مسکین	عبدالوحید
تسکین	میر حسین	صاحب	امۃ الفاطمہ	مضطر	مرزا انگین بیگ
تسکین	مظفر بیگ	صبر	اجودھیا پرشاد	ملال	محمد حسین زیدی
تہور	مرزا فخر الدین	صغیر	میاں جان	موجہ	حشمت علی خاں
ثروت	محمد بخش	ظہور	ظہور علی صدیقی	ناظم	یوسف علی خاں
خورشید	خورشید احمد	عظمت	عظمت اللہ	نسیم	اصغر علی خاں
راحت	مرزا محمود بیگ	عنایت	عنایت علی خاں	وحشت	غلام علی خاں
راسخ	سعادت علی خاں	غمگین	میر عبداللہ	وزیر	وزیر علی خاں
سالک	قربان علی بیگ	غربت	ہدایت علی خاں	یاس	حکیم خیر الدین
سروش	عبدالوہاب خاں	غریب	غریب اللہ		

سروش وغیرہ۔ ان اساتذہ کو رنگ مومن اس قدر بھایا کہ ان میں سے بیشتر کا رنگ سخن آخر وقت تک مومن سے قریب رہا۔

مومن کی شاعری کا امتیازی وصف تغزل ہے بقول عبادت بریلوی "اردو غزل کی روایت میں مومن کی آواز بالکل نئی اور اچھوتی ہے۔ اس آواز میں لوچ اور بانکپن ہے اس سے مومن کا تغزل پہچانا جاتا ہے" اور یہی وہ خصوصیت ہے جو مومن سے ان کے تلامذہ کے یہاں منتقل ہوئی۔ فرق اس قدر ہے کہ مومن نے اپنی غزل کو صرف عشق و محبت کے دائرہ تک محدود رکھا اور ان کے تلامذہ نے ان سرحدوں کو پار کر لیا۔ مگر ان کی شاعری کا رچا ہوا انداز تغزل ان کے شاگردوں کے یہاں بھی نمایاں ہے۔ ذیل کی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

عنایت: دیکھوں پھر ہوتی ہے آرایش گیسو کس طرح — تم کو دکھلاؤں اگر حال پریشاں اپنا

تسکین: غش سے اک آن افاقہ نہیں ہوتا تسکین — اس کے آنے کا جو بالیں پہ گماں ہوتا ہے

قلق: جیتے رہے ہیں مردن دشوار کے لیے — مرتے رہے ہیں عمر بھر انداز یار پہ

وحشت: تھکا ہے منزلوں کا پیام پاس لاتا ہے — الہی خیر کچھ نامہ بر کچھ شست آتا ہے

شیدا: کہتے ہیں اس کے کوچہ میں مارا گیا کوئی — مجھ کو یہ خوف ہے کہ مرا نامہ بر نہ ہو

غمگین: آنے تو را نہ اور تو مر ہی چلے تھے ہم — تم نے تو کہہ دیا کہ ہمیں کچھ خبر نہیں

شیفتہ: گھبرا کے اور غیر کے پہلو سے لگ گئے — دیکھا اثر یہ نالۂ بے اختیار کا

"آنسو" کا ذکر روداد محبت میں ناگزیر ہے مگر نسیم دہلوی نے آنسو کا ذکر جس انداز سے کیا ہے اس نے شعر میں ندرت پیدا کر دی ہے۔

نسیم: کبھی آغوش میں رہتا کبھی رخساروں پہ — کاش اے آفت جاں میں ترا آنسو ہوتا

شیدا کے یہ اشعار سنیے:

دریا بہیں کہیں کہیں مژگاں بھی تر نہ ہو — مر جائے کوئی اور کسی کو خبر نہ ہو

وہ دشمنی میں پورے ہوں یہ بات بھی نہیں — کہتے ہیں زہر دے کے الہی اثر نہ ہو

برق کا شعر ہے:

کس واسطے خوش آئی تجھے دل کی خرابی　　اے خانہ برانداز یہ تیرا ہی تو گھر تھا

شیفتہ کہتے ہیں :

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ　　اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

اس تغزل کی نفسیاتی وجہ مومن کے یہاں تو ان کی حسن پرستی اور لذت پسندی ہو سکتی ہے ۔ لیکن ان کے جمالیاتی احساس کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور مومن سے اس ورثہ کو جن شاگردوں نے حاصل کیا انھوں نے اس جذبہ میں مزید نکھار پیدا کر دیا ۔

معاملہ بندی کا جب ذکر آتا ہے تو اردو شعرا میں جرات اور مومن کا نام بے اختیار زبان پر آجاتا ہے ۔ مومن نے کوچۂ محبوب کی خاک چھانی ہے ۔ محبت کے تجربات نے جنسی جذبات کو بھی ابھارا ہے اور رسم عاشقی کو بھی نبھایا ہے ۔ مگر مجازی اور جنسی محبت کے باوجود انھوں نے کبھی آداب عاشقی کو فراموش نہیں کیا یہی وہ فرق ہے جو مومن کو جرات سے امتیاز بخشتا ہے اور یہی وہ نشان منزل ہے جس کو ان کے تلامذہ نے بھی اپنایا ۔ ذیل کے اشعار پڑھیے ان میں ابتذال یا سطحیت کا ذرا بھی اثر نہیں ملے گا ۔

تسکین : شب وصال میں سننا پڑا فسانۂ غیر　　سمجھتے کاش وہ اپنا نہ رازدار مجھے

شیفتہ : تنگ آ نہ کرائے شوق ہم آغوش کہ وہ　　ڈھونڈتے ہیں چلے جانے کو بہانہ شب وصل

سروش : سر کا دو سر اپنا مرے زانو پہ نہ رکھو　　سو بھی رہو جا کر وہیں جاگے ہو جہاں رات

سمجھو : ابروے دل بچا تو مژہ سے جگر چھدا　　رد کی ادھر کی چوٹ تو کھائی ادھر کی چوٹ

تسکین (مظفر بیگ) آئنہ رکھ کے بوسے لیے اُن کے دور سے　　ہم ہجر میں بھی وصل کی لذت اُٹھا چکے

برق : پوچھا جو اس نے آپ ہمیں چاہتے ہیں کیا　　بے ساختہ زباں سے مری 'ہاں' نکل گیا

سروش : ہیہات بے کل سے وہ اب ہاتھ دل پہ ہے　　رہتی تھی جس میں ان کی کلائی تمام رات

نازک خیالی کو اگر سلیقہ سے پیش کیا جائے تو وہ شعر کا حسن ہے اور اگر سلیقہ سے ادا نہ ہو تو شعر پیچیدہ اور معما بن جائے گا ۔ نازک خیالی کا اظہار کبھی تو خیال کی نزاکت سے ہوتا ہے اور کبھی درمیان کی بے ربط کڑیوں کے جوڑنے سے ہوتا ہے ۔ یہ وہی وصف ہے جس کے بارے میں حالی نے مومن کے حق میں فتوا دیا تھا کہ اس وصف میں وہ مرزا غالب سے سبقت لے

گئے ہیں۔ مومن کے اس امتیازی وصف میں ان کے تلامذہ بھی شریک ہیں۔ وفا کے عہد کے ٹوٹ جانے پر اصغر کس خوبی سے محبوب کی حمایت میں جواز پیش کرتے ہیں۔

اس نازکی پہ اس سے تو ہرگز نہ ٹوٹتا　　　اصغر وفا کا عہد ہی ناپایدار تھا

محبوب کو دعوا ہے کہ اس کی زلف کی درازی میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ شیفتہ کی نازک خیالی دیکھیے کہ طول امل کو زلف کی درازی کے مقابلہ میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ امیدوں کا بھی سلسلہ لامتناہی ہے اس لیے محبوب کی زلفوں کی انفرادیت ختم ہوگئی۔

یکتا کسی کو ہم نے نہ دیکھا جہان میں　　　طولِ امل جواب ہے زلفِ دراز کا

مومن نے بھی محبوب کی یکتانفسی کا بھرم اپنے سحر حلال (شاعری) کے سامنے ان الفاظ میں ختم کیا تھا۔

رواں فزائی سحرِ حلال مومن سے　　　رہا نہ معجزہ باقی لبِ بتاں کے لیے

ذیل کے اشعار بغیر کسی تبصرہ کے پڑھیے اور شاعر کی نازک خیالی کی داد دیجیے۔

برق : کس واسطے خوش آئی تجھے دل کی خرابی　　　اے خانہ برانداز یہ تیرا ہی تو گھر تھا

ظہور : حیراں ہوں دیکھ کر سرِ مژگاں پہ اشک کو　　　کیوں طفل بے گناہ کو کھینچا ہے دار پر

کرم : نام کب آسودہ جاں لیں نالہ ہائے زار کا　　　سرمۂ آواز ہے سایہ تری دیوار کا

وحشت : سارے عالم سے صفائی ہوئی اپنی وحشت　　　کیا مکدر کہیں وہ آئنہ رخسار ہوا

تلامذۂ مومن کے یہاں عشقیہ موضوعات کی جو فضا ملتی ہے وہ مومن کی طرح مسرت، شگفتگی اور شوخی کی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ذہنی اور جذباتی وابستگی میں ایک مفاہمت موجود ہے جس کی وجہ سے شاعر اپنی حد سے تجاوز نہیں کرنے پاتا۔

پروفیسر ضیا احمد بدایونی نے مومن کی ایک خصوصیت کی طرف خاص طور سے اشارہ کیا ہے وہ ان کا "مکر شاعرانہ" ہے۔ اس وصف سے مراد یہ ہے کہ شاعر بات کو اس طرح کہے کہ بظاہر مخاطب اپنا فائدہ خیال کرے مگر حقیقت میں خود شاعر کا نفع پوشیدہ ہو۔ اگرچہ مومن اس کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی مگر کہیں کہیں ان کے اثر سے ان کے تلامذہ کے یہاں بھی اس کی جھلک نظر آجاتی ہے۔

آہی : تمھارے حسن میں گرمی نہیں ہے — اگر ہوئے تو وا بندِ قبا ہو
تسکین: کہتے ہیں رنجشِ ظاہر میں مزا آتا ہے — یونہی تم مجھ سے ذرا ہو کے خفا مل جانا
راحت: قاتل تو ایک بوسہ مجھے دے کے قتل کر — لازم ہے کچھ تو دینی دیت بے گناہ کی

سب جانتے ہیں کہ ابتدا میں غالب اور مومن دونوں نے ناسخ کے رنگِ سخن کی پیروی کی۔ مگر بعد کو غالب رنگ میر کی طرف چلے گئے اور مومن نے انفرادی رنگ اختیار کیا۔ اس انفرادی رنگ کی شناخت جہاں ان کے خیال اور مضامین کے موضوعات سے ہوتی ہے وہاں اس کا ایک ذریعہ ان کی مخصوص تراکیب بھی ہیں۔ اگرچہ مومن کے بعد زبان نے جب اپنے آپ کو فارسیت کی گرفت سے آزاد کیا تو یہ فارسی کی ترکیبیں آہستہ آہستہ اپنا رُخ بدلنے لگیں۔ تاہم ان تراکیب کا کہیں کہیں استعمال مومن کے تلامذہ کے یہاں نظر آتا ہے۔ یہ اشعار پڑھیے اور دیکھیے کہ انھوں نے استاد کی تراکیب کو کس انداز سے برتا ہے[1]:

تسکین: ساکنانِ تہ فلک پر دیکھیے کیسی بنے — لالۂ سوزاں کا ہے اب کے ارادہ دُور کا
برق : سودائے محبت میں کیے نالۂ و افغاں — حاصل نہیں ہر کام سے اک جی کا ضرر تھا
شیفتہ : دل سختیاں سہے یہ کہاں نازکی تن — دلّی کے سنگدل تو بتان چگل نہیں
قلق : خلش جائے تو کیا جائے زلیخان اور باتی ہے — بچایا آبلہ پائی سے میرے خار ماہی کو
قلق : ربط اے پردہ نشیں سب سے رہا تیرے لیے — زندگی اپنی کٹی حرف اشارا ہو کر

---

[1] ان تراکیب کا استعمال مومن کے یہاں ملاحظہ ہو:

سیکھے ہیں مجھ سے نالۂ نہ آسماں شکن — صیاد اب قفس میں عنادل کو تھامنا
دل سختیوں سے آئی طبیعت میں نازکی — صبر و تحملِ قلقِ جاں نہیں رہا
گر وہاں بھی یہ خموشی اثر افغاں ہوگا — حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا
بچاؤں آبلہ پائی کو کیوں کر خار ماہی سے — کہ بامِ عرش سے پھسلا ہے یارب پاؤں دقت کا
عشق پردہ نشیں میں مرتے ہیں — زندگی پردہ در نہ ہو جائے

شورش : کیا جانے عدو خون جگر پینے کی لذت   شورش سے مزا پوچھیے تلخاب الم کا

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تراکیب کی حیثیت ایجادِ بندہ کی ہے جس کے باعث کبھی کبھی خیال کے ادا کرنے یا شعر کے حسن میں رکاوٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس اجتہاد نے زبان کا دائرہ بڑھایا ہے اور زبان میں تنوع پیدا ہوا ہے۔

اسی کے ساتھ دلچسپ بات یہ ہے کہ اکثر تلامذہ نے مومن کے رنگ کو اس طرح اپنایا ہے کہ اگر شاعر کا نام نہ لکھا جائے تو پہچاننا مشکل ہے۔ شاعر اپنے اندازِ قد سے پہچانا جاتا ہے مگر جب دوسرے قدم بھی اسی انداز اٹھیں تو یہ فرق کرنا مشکل ہے کہ کونسا قدم کس کا ہے۔ ذیل کی مثالوں سے ہمارے دعوے کی تائید ہوتی ہے۔

تسکین : دل دینے کی قتل ہی سزا ہو   قائل ہیں تمہاری منصفی کے

تسکین : ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے   کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

شیفتہ : شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں   جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب میں

شیفتہ : ہر شیوہ سے ٹپکے ہے ادا ناز تو دیکھو   ہر بات میں اک بات ہے انداز تو دیکھو

برق : ہم تو کہتے تھے کہ جنت میں لگے گا کیا جی   بارے کچھ اس میں بھی نقشہ ترے گھر کا نکلا

سالک : رہ گئیں دل میں حسرتیں سالک   آگئی عمر پارسائی کی

اکبر : خانۂ غیر میں گر لگنے لگا دل تیرا   مجھ کو بھی اور سے آتا ہے لگانا دل کا

صاحب : کھولے ہیں اس نے پیرہن یوسفی کے بند   تہہ کر رکھے نسیم سے کہہ دو قبائے گل

صغیر : ہوا ہو سو ہو تو پھر خوب یاد کر لیجے   کہ رہ نہ جائے کوئی جور امتحاں کے لیے

نسیم : منہ میرا نہ کھلواؤ کہ ہو جائیں گے لب بند   دیکھو یہی اچھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

موجد : کہاں میں اور کہاں ترک محبت   نصیحت کی بھی ناصح نے تو کیا کی

اکبر : ہم مر گئے اور اس نے نہ جانا کہ مر گئے   ہر زخم پر جو ہلتے تھے لب آفریں کے ساتھ

شیفتہ : بے عذر وہ کر لیتے ہیں وعدہ یہ سمجھ کر   یہ اہل مروت ہیں تقاضا نہ کریں گے

ان اشعار کو پڑھ کر محسوس ہوا ہوگا کہ وہی لب و لہجہ ہے جو مومن کا تھا۔ ان میں وہی

ارضی محبت کی صداقت اور خلوص نظر آئے گا جو مومن کی شاعری کا امتیازی وصف ہے ۔ احساس جمال اور جذب وشوق کا داخلی انداز جس نے غزل کو غزل بنادیا ان اشعار میں نمایاں ہے ۔ یہ تمام اشعار خود شاعر کے گرد گھوم رہے ہیں اور وہی ان کا مرکزی کردار ہے ۔

مومن کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ ان کا مسلک وہابیت تھا اس لیے تصوف کو انھوں نے آرائش گفتار کی خاطر بھی اپنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ جب بھی موقع ملا اس کو اپنے طنز کا ہی نشانہ بنایا ۔مگر یہ مومن کی اپنی ذات کا معاملہ تھا۔ ان کے عہد میں اور ان کے بعد کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس نے تصوف سے گریز کی کوشش کی ہو۔ چنانچہ تلامذۂ مومن میں بعض نے تصوف میں ڈوب کر لکھا ہے ۔ برق کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے بڑھے ورنہ تو پردہ اٹھادے تو، تو ہی تو ہو جائے

تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے

برق کا ہی شعر ہے ۔

اب نہیں تاب تحمل تو اٹھا رخ سے نقاب اک فسانہ ہو گیا عالم میں جلوہ طور کا

ظہور کہتے ہیں ۔

ہے چار طرف حسن کی جس کے یہ تجلی وہ شاہد یکتا نہیں معلوم کدھر ہے

تصوف دراصل مجاز سے حقیقت کی طرف ایک سفر ہے ۔جب وہ اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ جس ذات کی تلاش میں نکلے تھے وہ خود اپنی ذات میں پوشیدہ ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین نے ’عشق‘ کی مجازی اور حقیقی تقسیم کو بے معنی قرار دیا ہے ۔

ع ورنہ تو پردہ اٹھادے تو، تو ہی تو ہو جائے

اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ دراصل شاعر اپنے جذبات کے اظہار کے لیے راستے تلاش کرتا ہے اور اس راستے میں اس کا واسطہ جزو سے پڑتا ہے اس کو نامکمل خیال کر کے ان اجزا کو کل کی صورت میں ترتیب دینا چاہتا ہے ۔جوں جوں حقیقت کا ادراک ہوتا

جاتا ہے اسی قدر بقول سالک

جس قدر اس نے خودنمائی کی   راز کھلتے گئے زمانے پر

خیر وشر۔ تقدیر و تدبیر۔ قدیم و حادث یہ سب اس وقت تک مباحث و مسائل تھے جب تک حقیقت پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ تصوف کا یہی رشتہ ہے جو مذہب کے اخلاقی نظام سے ملتا ہے۔ اردو غزل میں اخلاقی اصول وضوابط کا سب سے زیادہ اظہار تصوف کے ذریعہ ہوا ہے۔ قناعت۔ صبر۔ توکل۔ رضائے الٰہی۔ دُنیا سے بے نیازی۔ دُنیا کے نشیب و فراز سے عبرت۔ خودداری۔ ضبط نفس وغیرہ۔ مومن کے یہاں اخلاقی مضامین کی کمی ہے اگر کہیں ہے بھی تو محض عاشقانہ پس منظر میں اس کا اظہار ملتا ہے۔ مثلاً مومن کے یہ اشعار

چل کے کعبے میں سجدہ کر مومن   چھوڑ اس بُت کے آستانے کو
نقش پائے رقیب کی محراب   نہیں زیبندہ سر جھکانے کو
کیوں سنے عرض مضطرا ے مومن   صنم آخر خدا نہیں ہوتا

مگر ان کے تلامذہ نے اخلاقیات کے مضامین کو شعوری طور پر پیش کیا ہے۔

ظہور: نہیں کچھ بود و نابود جہاں جائے غم و شادی   کہ یاں اسباب دنیا کو نہ ہرگز دیر پا دیکھا
گدا کو اے ظہور اک دم میں دیکھا یاں غنی ہوتے   غنی کو ایک لمحہ میں یہاں ہوتے گدا دیکھا

شیفتہ: رات واں گل کی طرح سے جسے خنداں دیکھا   صبح بلبل کی روش ہم دم افغاں دیکھا

نسیم: دو رنگی ابلق ایام کی طرفہ تماشا ہے   جسے بالائے زیں دیکھا، وہی زیر زمیں آیا

تلامذۂ مومن کے سلسلہ میں بات نامکمل رہ جائے گی اگر ان کی زبان و بیان کے بارے میں چند امور کا اظہار نہ کیا جائے۔ غالب و مومن اپنی مشکل پسندی کے لیے ناقدین ادب کا نشانہ بنے رہے اور روایتوں کے غبار میں ان دونوں کے کلام کے اس پہلو سے بے نیازی برتی گئی جو سادگی اور سہل ممتنع کی مثال تھا۔ تلامذۂ مومن نے استاد کے رنگ کو زیادہ شستہ اور برجستہ بنایا۔ مجموعی طور پر تمام تلامذہ کے یہاں مزاج سادگی پسند ہے حالی کا وہ قول آج بھی سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان کو غالب سے وہ فائدہ نہیں پہنچا جو شیفتہ کی صحبت

سے میسر آیا۔ اس اعتراف کے پیچھے شعر کی وہ تمام خوبیاں تھیں جن کو کسی نقاد نے "سادگی۔ جوش اور اصلیت" سے منسوب کیا تھا۔ کلیات شیفتہ کے مقدمہ میں کلب علی فائق نے لکھا ہے۔

"شیفتہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقایق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دل فریب بنانا اس کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ بازاری الفاظ و محاورات۔ عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے"

یہ عہد اپنی سادگی اور سلاست بیان کے لیے مشہور ہے۔ چاک گریباں پر میر کا مشہور شعر تو آپ نے سنا ہو گا جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اس کا جواب لکھنا قل ھو اللہ کے جواب لکھنے کے مترادف ہے۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے　　دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

اس شعر کا واقعی جواب ممکن نہیں ہے مگر پھر بھی آہی نے جس خوبی سے محبوب کے شہر میں نہ نکلنے کا ثبوت چاک گریبان کے واسطے سے پیدا کیا ہے اس میں ندرت ہے۔

ہے غلط دھوم کہ نکلا تھا وہ گھر سے باہر　　شہر میں چاک کسی کا تو گریباں ہوتا

چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں۔

شیفتہ:	مرنے کا مرے نہ ذکر کرنا	قاصد وہ بہت الم کریں گے
"	یاد نے جس کی بھلایا سب کو	اس کی میں یاد بھلاؤں کیوں کر
تسکین:	اب یہ حالت ہے کہ ان سا ہے درد	میرے بچنے کی دعا مانگے ہے
"	تھے جن سے گمان دوستی کے	دشمن ہوئے وہ ہمارے جی کے
آہی:	شکوہ کہاں کا کیسا گلہ، جی نکل گیا	شرما کے یار نے جونہی نیچی نگاہ کی
سالک:	رہ گئیں دل میں حسرتیں سالک	آگئی عمر پارسائی کی
ناظم:	واعظ و شیخ بھی کیا خوب ہیں کیا بتلاؤں	میں نے میخانہ سے کس کس کو نکلتے دیکھا
یاس:	عشوہ و ناز و ادا طعنہ سے کہتے ہیں مجھے	ایک دل رکھتے ہو کس کس کو دیا چاہتے ہو

برق : کوے جاناں سے نکلتے ہی یہ حالت ہوگئی   جس طرح بارا تھکا آئے مسافر دور کا
نسیم: سفر ہے دشوار، خواب کب تک، بہت پڑی منزلِ عدم ہے
نسیم جاگو، کمر کو باندھو، اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

زبان و بیان کے سلسلہ میں تشبیہات، استعارات، علامت نگاری اور صنائع بدائع کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے مگر طوالت کے خوف سے اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔ تلامذۂ مومن نے اس لب ولہجہ کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے جو اس عہد کا مزاج تھا میری مراد سادگی اور بے ساختگی سے ہے۔ اس عہد کے دوسرے شعرا داغ، جلال سب نے اس سادگی اور پرکاری کو اپنا شیوہ بنایا ہے اس لیے اس مزاج سے ہٹ کر طرزِ ناسخ اور اندازِ بیدل کو اپنانا ان شعرا کے لیے ممکن بھی نہ تھا۔

ڈاکٹر اسلم پرویز

غالب اور مومن

غالب اور مومن اُردو کے دو متعارف شاعر ہیں لیکن اس بات کو بہتر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ غالب اُردو کے بڑے اور مومن اُردو کے اچھے شاعر ہیں۔ اُردو تنقید میں یہ سوال اکثر اٹھایا گیا ہے کہ غالب اور مومن میں سے واقعی بڑا شاعر کون ہے۔ اس سوال کا جواب بالواسطہ طور پر نہ سہی بلا واسطہ نیاز فتح پوری دے بھی چکے ہیں، یہ کہہ کر کہ :

> "اگر میرے سامنے اُردو کے تمام شعرائے متقدمین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہوں گا کہ مجھے کلیاتِ مومن دے دو اور باقی سب اٹھا لے جاؤ۔"[۱]

گویا نیاز فتح پوری کے نزدیک مومن، غالب سے بڑے شاعر ہیں۔ غالب اور مومن کے موضوع پر اب تک جن لوگوں نے بھی قلم اٹھایا ہے اُن میں سے بیشتر کی نیت یہ رہی ہے کہ کسی نہ کسی اعتبار سے غالب پر مومن کی برتری ثابت کی جائے عبدالباری آسی نے اپنے مضمون موازنۂ مومن و غالب[۲] میں دونوں شاعروں کے موازنے کی جو کوشش کی ہے اس میں اگرچہ غالب اور مومن کے قصائد، مثنویات، رباعیات اور غزلیات سبھی کو لیا گیا ہے لیکن انھوں نے اپنی بحث کو زیادہ تر غالب اور مومن کے غزلیہ اشعار پر مرکوز کیا ہے جو درست معلوم دیتا

ہے۔ آسی نے ان اشعار کے موازنے کی دو سطحیں متعین کی ہیں یعنی ایک تو وہ جہاں دونوں شاعروں کے ہم قافیہ اشعار کا جائزہ لیا گیا ہے اور دوسری وہ جہاں دونوں شاعروں کے اشعار کے مضمون ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ آسی نے دونوں طرح کے اشعار میں کم و بیش ہر جگہ مومن کے شعر کو غالب کے شعر سے بہتر بتایا ہے۔ آسی کا بنیادی مقصد شاید مومن کی برتری ثابت کرنا ہی تھا اس لیے انھوں نے مومن کے بہتر شعروں کا انتخاب شاید پہلے سے کر کے ان کے مقابلے میں غالب کے کم تر شعر رکھ دیا ہے۔ یہ اسی طرح کا اندازِ تنقید ہے جو دبستانِ دہلی اور دبستان لکھنؤ کے موازنے کے سلسلے میں ہوتا رہا ہے جہاں جرأت، رنگین اور انشا جیسے شاعروں کے کلام سے صرف رکیک و مبتذل اشعار چھانٹ کر انھیں میر اور درد وغیرہ شاعروں کے داخلی قسم کے اشعار کے مقابلے میں رکھ کر کم تر ثابت کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں ایک جائز سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا محض چند ہم قافیہ اور ہم مضمون اشعار کا موازنہ پیش کر دینے سے نقاد اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہو جاتا ہے۔ ایک اور مضمون نگار نے 'غالب اور مومن' کے موضوع پر اپنے مضمون میں دونوں شاعروں کے ایسے دو شعر پیش کیے ہیں جو شاعری ہی سے متعلق ہیں اور غالب اور مومن کے اسی ایک ایک شعر کی بنیاد پر دونوں کے مرتبے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اس ضمن میں غالب کا جو شعر پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا ‏ ‏ ‏ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

فاضل مضمون نگار کا خیال ہے کہ یہ شعر اس بات کا غماز ہے کہ غالب اشعار کے سلسلے میں ستائش کی تمنا بھی رکھتے تھے اور صلے کی پروا بھی کرتے تھے۔ اسی مضمون میں مومن کا یہ شعر پیش کیا گیا ہے ؎

انصاف کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر ہم ‏ ‏ ‏ تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

یہ شعر پیش کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ ہر انصاف پسند ذہن اس اعتراف پر مجبور ہے کہ مومن کا شعر شاعرانہ فطرت سے زیادہ قریب ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان اشعار میں شاعرانہ فطرت سے زیادہ وہ انسانی فطرت سامنے آتی ہے جہاں ایک شاعر کے ہاں طمع ہے اور دوسرے کے ہاں قناعت۔ کہا یہ جاتا ہے، اور یہ بڑی حد تک صحیح بھی ہے، کہ مومن ایک خوددار قسم کے انسان

تھے غالب کے ہاں اس کے برعکس صورتِ حال ملتی ہے۔ لیکن اگر ایسی ہی غیر تنقیدی بنیادوں پر کسی شاعر کی کمتری یا برتری کا فیصلہ کرنا ہے تو پھر مومن کے ایک خط کی یہ عبارت بھی ملاحظہ ہو :

"چونکہ اس اُجڑے دیار (دہلی) میں جاہل اور بے قدر کافروں کے ہاتھ میں پڑ کر شرفا کی قدر کیمیا کی خاصیت، اور دولت و اقبال عنقا کا حکم رکھتا ہے اس نظر سے سفرِ لکھنؤ کا ارادہ ہے اور اگر وہاں کار برآوری ہو تو فبہا ورنہ اس ملک (حیدر آباد) کا ارادہ بھی دل میں ہے کیوں کہ اکثر لوگوں نے ارباب کمال خصوصاً شعرا کے حق میں لالہ چندو لال بہادر کی قدر دانی کا ذکر کیا اور یہ ہیچمداں اُس باغ کی خوشبو سے مست ہے۔ اگر حق تعالےٰ کو منظور ہے تو وہاں پہنچ کر دولت قدم بوسی سے سعادت اندوز ہوں گا اور لالہ صاحب مذکور کے والد کا ارتباط جو ہمارے خاندان سے رہا ہے عرض کروں گا۔"[۲]

دراصل غالب اور مومن کی مثال ایسے دو متوازی خطوط کی سی ہے جو آپس میں کہیں نہیں ملتے لیکن ان دونوں میں ایک خط ایسا ہے جو کچھ دُور جا کر ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا بہت دُور تک جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ غالب اور مومن فکر اور تخیل کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ غالب کی ذہنی فضا لامحدود ہے اور مومن کی ذہنی فضا محدود۔ ذہن کی ساخت اور پرداخت قدرت کی دین ہے جس کے لیے نہ غالب کو ذمے دار ٹھہرایا جا سکتا ہے اور نہ مومن کو۔ اس کے علاوہ ہر فن کار کے فکری اور فنی رویوں کی تشکیل میں اس کے انفرادی اور سماجی حالات کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ انہیں حالات میں اس کے ذہن کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے غالب اور مومن کا فرق صرف دو شخصیتوں کی اپنی اپنی افتادِ طبع کا ہی فرق نہیں ہے بلکہ یہ اُس ماحول کا بھی فرق ہے جس میں غالب اور مومن علاحدہ علاحدہ پروان چڑھے۔

تمام انسانی شخصیتیں تاریخ کی مخلوق ہوتی ہیں لیکن جس طرح سماج میں رہنے والے مختلف افراد کا سماجی مرتبہ یا سوشل STATUS ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے ٹھیک اسی طرح تاریخی مخلوق ہونے کی حیثیت سے بھی مختلف افراد کا تاریخی مرتبہ یا STATUS ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے اس اعتبار سے غالب اور مومن دونوں علاحدہ علاحدہ

تاریخی STATUS کے مالک ہیں۔

غالب اگرچہ دہلوی کہلاتے تھے لیکن سچ پوچھیے تو وہ ایک بے وطن قسم کے انسان تھے۔ ایک پردیسی پشتینی پردیسی جسے آج کل کی انگریزی ادب کی اصطلاح میں OUTSIDER کہہ سکتے ہیں۔ غالب شادی کے بعد آگرے سے دہلی آئے۔ والد کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا اور چچا نے اُن کی پرورش کی۔ اُن کے باپ بھی ملازمت کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف شہروں کی خاک چھانتے پھرے اور اُن کے دادا تو خیر باہر سے ہی آئے تھے۔ غالب زندگی بھر فکرِ معاش میں مُبتلا رہے۔ دہلی میں اُن کا اپنا کوئی ذاتی مکان نہیں تھا اور وہ مکان بدل بدل کر کرائے کے مکانوں میں رہتے رہے۔ غالب کا المیہ وہی تھا جو آج کل کے متوسط طبقے کا المیہ ہے اُن کے پاس ذہانت تھی، علم تھا، ایک فریب خوردہ انا تھی۔ خواہشات کی کشمکش سے پیدا ہونے والا گھٹیاپن تھا اور زندگی کی آسائشوں کا وہ خواب تھا جو سماج کے اعلا طبقے کے طرزِ زندگی سے عبارت تھا۔ وہ ایک ہی ساتھ رند بھی تھے اور اچھے دُنیادار بھی اور صوفی منش بھی۔ یہی نہیں اُن کی زندگی میں ایسے بہت سے تضادات تھے۔ غالب، مومن کی طرح جذباتی نہیں تھے۔ اُن کے ہاں فکر کو جذبات پر فوقیت تھی۔ آگہی کی سطح پر وہ ایک ایسا ترشا ہوا ہیرا دکھائی دیتے ہیں جس سے پھوٹنے والی شعاعیں زمان و مکان کی سرحدوں پر کمندیں ڈالتی دکھائی دیتی ہیں۔ غالب کے ذہنی افق میں بلا کا پھیلاؤ اور وسعت ہے وہ سفر پر بھی نکلتے ہیں تو بھوپال تک جا کر نہیں لوٹ آتے بلکہ بنگال کی کھاڑی پہنچ کر دم لیتے ہیں۔

غالب کے برعکس مومن صحیح معنوں میں دہلوی تھے۔ اُن کا خاندان تین پُشتوں سے دہلی میں آباد تھا وہ ایک خوش حال گھرانے کے فرد تھے اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے اور زندگی بھر آسودگی کے ساتھ اُسی مکان میں رہے۔ وہ والدین کی ہی سرپرستی میں پلے بڑھے۔ انھوں نے ایک مذہبی فضا میں آنکھ کھولی اور باپ دادا کی روش پر چلتے ہوئے خود بھی اتنے ہی مذہبی رہے۔ انگریزی نظام کے بارے میں کٹر قسم کے مُسلمانوں کا جو رویہ تھا وہی مومن کا بھی تھا۔ وہ انگریزی نظام کی صرف خرابیوں کو دیکھ سکتے تھے اور اُن میں بھی شاید صرف اخلاقی خرابیوں کو۔ اس نظام کے سائے میں ذہنی اور سماجی تبدیلی کا جو دیپ روشن تھا اُس کی لو کو مومن کی نظر نہ دیکھ سکتی

تھی۔ وہ لباس، وضع قطع، طرزِ زندگی ہر معاملے میں ایک رکھ رکھاو اور نظم و ضبط کے پابند تھے۔ بحیثیت مجموعی وہ ایک نفیس انسان تھے اُن کی زندگی کا محور عشق تھا۔ انھوں نے اپنی نفاست کو کبھی بھی سماجی شعور اور حیات و کائنات کے مسائل سے داغ دار نہیں ہونے دیا۔ وہ ایک راسخ العقیدہ سلمان تھے ایک غیر مقلد اور کٹر مسلمان۔ اُن کے ہاں جذبات کو افکار پر فوقیت حاصل تھی جس کا ثبوت انھوں نے اپنی عشقیہ شاعری سے بہم پہنچایا ہے۔ تضاد کے بغیر شخصیت میں اور خصوصاً فن کارانہ شخصیت میں رنگ نہیں پیدا ہوتا۔ مومن غالب کی طرح مجموعہ اضداد تو نہیں تھے لیکن ایک تضاد اُن کے ہاں بھی ہے اور شاید اسی تضاد کی وجہ سے تاریخ ادبِ اُردو میں اُن کے وجود کو محسوس کیا جاتا رہے گا یعنی یہ کہ اُن کا عاشقانہ مسلک ایک راسخ العقیدہ مومن مسلمان سے بالکل مختلف ہے۔

اپنی عاشقانہ شاعری میں وہ بتوں کو بھی پوجتے ہیں، گاتے بجاتے بھی ہیں اور رقیب کی موت کے بھی درپے ہیں۔ اور اُن کی ان تمام باتوں میں کوئی شاعرانہ ابہام اس لیے نہیں ہے کہ وہ اُس تصوف سے کوسوں دور ہیں جو مجاز اور حقیقت کے جلوے ایک ساتھ دکھاتا ہوا چلتا ہے۔

غالب اور مومن کے اس فرق کو ذہن میں رکھتے ہوئے جو بہت واضح طور پر ہمارے سامنے ہے دونوں پر ایک ساتھ گفتگو کرتے ہوئے بڑے سنبھل کر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے غالب اور مومن کا موازنہ کرتے ہوئے ہم اپنے دائرۂ کار کو صرف دونوں شاعروں کی ہم طرح غزلوں یا ایسے اشعار تک محدود نہیں رکھ سکتے جن کے مضمون ملتے جلتے ہوں۔ ہمیں دراصل دونوں فن کاروں کی تخلیقی صلاحیتوں اور اُن صلاحیتوں کے فن کارانہ اظہار کو اپنا موضوع بنانا پڑے گا۔ فکری سطح پر غالب کی شخصیت مومن کے مقابلے میں ہمہ گیر دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے فکری سطح پر ہم غالب اور مومن کے کلام کا صرف وہی حصہ معرضِ بحث میں لا سکتے ہیں جس میں کسی نہ کسی طرح کا فکری عنصر ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب ہم جذباتی اور عاشقانہ سطح پر دونوں کے کلام کا جائزہ لیں تو ہمیں غالب کے کلام کے صرف اسی حصے کو معرضِ بحث میں لانا چاہیے جو جذباتی اور عاشقانہ شاعری کے ذیل میں آتا ہے۔ ایسی صورت میں جو نتیجہ برآمد ہوگا وہ یہ ہے کہ فکری سطح پر غالب، مومن سے کوسوں آگے ہیں جبکہ عاشقانہ اور جذباتی شاعری

کے معاملے میں غالب یوسف اور زلیخا کی دوڑ کی طرح مومن سے صرف اتنا ہی پیچھے ہیں کہ کبھی بھی ان کا پا تو مومن کے دامن پر پڑ سکتا تھا۔ مومن کی عشقیہ شاعری تو تمام و کمال ہمارے سامنے ہے ہی ذرا غالب کے کچھ عشقیہ اشعار بھی ذہن میں تازہ کرتے چلیں ؎

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

اسد بہارِ تماشائے گلستانِ حیات
وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

اور پھر اس کے ساتھ ہی غالب کی وہ غزل بھی یاد کرتے چلیے ؎
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے۔ یہ غالب کے وہ سیدھے سادے عشقیہ اشعار ہیں جن میں کوئی متصوفانہ ابہام نہیں ہے۔ ایسے کتنے ہی اور اشعار دیوانِ غالب سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

مومن کے بعض ناقدین نے مومن کے کلام کی تعریف کرتے ہوئے ان کے معائب کلام کی جانب بھی اشارے کیے ہیں جن میں پیچیدگی بیان، طب، رمل اور نجوم جیسے علوم کی نامانوس

اصطلاحوں کا استعمال، ڈھیلی بندشیں، بھرتی کے اور غیر ضروری اشعار کی بھرمار اور اسی طرح کے عیوب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس رطب و یابس کی وجہ سے اُن کے کلام کا بہتر حصہ اور بھی زیادہ تحلیل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس سلسلے میں عالم خوندمیریؔ نے مومن پر اپنے ایک مضمون میں بڑے پتے کی بات کہی ہے اور وہ یہ کہ کسی بھی شاعر کا پورا کلام خواہ وہ شاعر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو مستند نہیں ہوتا۔ اس کے کلام کا ایک بہت بڑا حصہ روایتی بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے خدائے سخن میرؔ کے ہاں بعض لوگوں کو لگ بھگ بیس ہزار اشعار میں سے بہتر شعر ہی مستند نظر آئے۔ کسی شاعر کے کلام کی پہچان اس کے کلام کا یہ مستند حصہ ہی ہوتا ہے۔ غالب نے اس اعتبار سے ایک سمجھ داری کا کام یہ کیا کہ اپنے کلام کے روایتی حصے کو نکال کر کم و بیش مستند حصہ ہی ہمارے سامنے پیش کیا۔ اس نقطۂ نظر سے مومن کے کلام کا مستند حصہ اُن کے روایتی کلام میں کھو یا ہوا سا ہے جس کی وجہ سے عام طور پر مومن کی کوئی ایسی واضح تصویر اُبھر کر ہمارے سامنے نہیں آتی جیسی غالب کی ہے۔ اس بات کو مومن کی بدنصیبی پر محمول کیا جاتا ہے کہ انہیں کوئی حالی جیسا نقاد نہیں ملا لیکن اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مومن کے مرنے کے بعد بھی ذوق اور غالب جیسے شاعر دہلی میں موجود تھے اس لیے مومن کی موت سے ایسا کوئی خلا نہیں محسوس کیا گیا جس کا احساس ذوق اور پھر غالب کی موت کے بعد ہوا جبکہ دہلی کی بساطِ سخن ہی اُلٹ کر رہ گئی تھی یوں بھی مومن ایک دم توڑتی ہوئی جاگیر دار تہذیب کے نمائندے تھے اور غالب اُبھرتے ہوئے ذی شعور متوسط طبقے کی علامت۔ مومن کی شاعری دل میں گھر کر لینے والی ضرور تھی لیکن فکری سطح پر اتنی طاقتور نہیں تھی کہ اس کی کوکھ سے کوئی حالی پھوٹ پڑتا۔

حیات و کائنات کے مسائل پر غالب ایک حکیم، ایک فلسفی اور ایک دانشور کی حیثیت سے غور کرتے ہیں اور مومن صرف ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے۔ غالب کائنات کے راز جاننے یا اُن پر سے پردہ اُٹھانے کی جستجو میں محو نظر آتے ہیں مومن کے نزدیک کائنات کے تمام اسرار جانے بوجھے ہیں جن کا حال وہ عقائد کے صحیفوں میں پڑھ کر یا اپنے بزرگوار اور پیر و مرشد سے سن کر مطمئن ہو چکے ہیں۔ اس بارے میں ان کے دل میں کوئی ایسا وسوسہ نہیں اٹھتا جو پیکرِ تخئیل میں ڈھل کر شعر بن جانا چاہتا ہو۔ وہ اپنے علمِ نجوم کی بنیاد پر یہ خوب صورت شعر تو کہہ

سکتے ہیں ؎

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی بے ستم ایجاد کیا

لیکن علم ہیئت کے مسائل سے دوچار ہوکر یہ شعر تو غالب ہی کہہ سکتے تھے ؎

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

یا ان کے قصیدے کا یہ شعر ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ   دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

انیسویں صدی کے وسط کا ہندوستان ایک تاریخی جوار بھاٹے کی زد میں تھا۔ مومن اس جوار بھاٹے کی لہروں پر صرف ہچکولے کھاتے نظر آتے ہیں اور غالب یہ سوچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ ؎ دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا۔ اُس دور کے سماجی سیاسی حالات کے ساتھ مومن کا تعلق صرف خبر کی حد تک ہے جبکہ غالب کے ہاں اس کی نوعیت نظر کی ہے۔ انسان جب تک خبر کے ساتھ کوئی ذہنی تعلق نہ پیدا کرے اس وقت تک صحیح نظر نہیں بن سکتی۔ فن کار کے تخلیقی رویے میں نظر جس طرح کا جادو جگاتی ہے وہ خبر نہیں جگا سکتی۔ مومن کی شاعری میں ایسی کوئی گونج نہیں سنائی دیتی جس سے یہ پتا چلے کہ ان کی عشق و عاشقی کی محدود دنیا کے باہر جو ایک وسیع و عریض جہان ہے وہاں کیا ہو رہا ہے۔ سید احمد رائے بریلوی کی تحریک جہاد سے مومن کو محض ایک جذباتی وابستگی تھی جو اُن کے خاندان کے اس بے پناہ مذہبی ماحول کی بنا پر تھی جس میں وہ پلے بڑھے تھے۔ وہ انگریزی نظام کی سماجی اور اقتصادی نزاکتوں کو نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک تو یہ نظام بس کفر و الحاد سے عبارت تھا اور اسی لیے وہ اس کے مخالف تھے۔ اُن کی جہادیہ مثنوی کے یہ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

عناد نہفتہ کو ظاہر کروں   دم تیغ سے قتل کافر کروں
پلے تشنہ کامی سبو در سبو   پیوں شوق سے ملحدوں کا لہو
یہی اب تو کچھ آ گیا ہے خیال   کہ گردن کشوں کو کروں پائمال

بہت کوشش وجاں نثاری کروں　　کہ شرعِ پیمبر کو جاری کروں
دکھادوں بس انجام الحاد کا　　نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا

چنانچہ اس مقدس تحریک جہاد کا بھوت جب اُن کے سر سے اُترتا ہے یا یہ کہیے کہ جب وہ اپنے نہاں خانۂ عشق میں واپس لوٹتے ہیں تو یہ کہتے سنائی دیتے ہیں ؎

وہ دن گئے کہ لاف وگزاف جہاد تھا
مومن ہلاکِ خنجرِ نازِ بتاں ہے اب

مومن کے مقابلے میں غالب ایک دُنیادار انسان تھے۔ بلا کے عیّار لیکن اس کے ساتھ ہی ذہین اور طباع بھی۔ وہ زندگی میں کسی طرح کے عقیدے یا مسلک کے ساتھ پوری طرح COMMITTED دکھائی نہیں دیتے لیکن وہ فکرونظر کی دولت سے مالا مال ہیں مغل دربار کی جانب سے مہرِنیم روز اور ماہِ نیم ماہ کی تالیف پر مامور ہونے والا شاعر جب آئینِ اکبری کی تقریظ لکھتا ہے تو وہ انگریزوں کو بُرا بھلا کہنے کے بجائے اُلٹا سرسید کو یہ کہہ کر لتاڑتا ہے ؎

صاحبانِ انگلستاں را نگر　　شیوہ و اندازِ ایناں را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند　　آنچہ ہرگز کس نہ دید آوردہ اند
داد و دانش با ہم پیوستہ اند　　ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند
نغمہا بے زخمہ از ساز آورند　　حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
پیشِ ایں آئیں کہ دارد روزگار　　گشتہ آئینِ دگر تقویم پار

جہادیہ مثنوی کے اُردو اشعار اور آئینِ اکبری کی تقریظ کے ان فارسی اشعار سے مومن اور غالب کے ذہنوں کا فرق بہت واضح ہو کر ہمارے سامنے آجاتا ہے اور جب غالب اس سے بھی اونچی سطح پر پہنچتے ہیں تو پھر مومن ان کے مقابلے میں ایک خطِ منحنی دکھائی دیتے ہیں ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم　　قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب　　لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز		میں ہوں اپنی شکست کی آواز
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا
شیوۂ رندانِ بے پروا خرام از من مپرس
ایں قدر دانم کہ دشوار است آساں زیستن

مومن کی شاعری کا صرف ایک پہلو ایسا ہے جہاں وہ شعرائے متقدمین اور ہم عصر شعرائے ممتاز نظر آتے ہیں اور وہ ہے ان کی عشقیہ شاعری۔ مومن کے ان تمام نقادوں نے جنھوں نے مومن کو اپنا ہیرو بنا کر پیش کیا ہے مومن کی عشقیہ شاعری ہی کی بنیاد پر دوسرے شعراء جن میں غالب بھی شامل ہیں مومن کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مومن کی عشقیہ شاعری صحت مند جذبات کی حامل ہے۔ یہ دو انسانوں کی جنسی محبت ہے جن میں ایک مرد ہے اور دوسرا عورت۔ اس شاعری سے ایسے جنسی تعلق کی مہک آتی ہے جو اس بوالہوسی سے بالاتر ہے جو جرأت کی معاملہ بندی کی شاعری میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک مہذب جنسیت ہے۔ اسی تہذیبِ عشق کو مومن نے اپنی شاعری میں "پردے" سے موسوم کیا ہے۔ اس لیے مومن کی عشقیہ شاعری میں "پردے" کو صرف برقع سمجھ لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم مومن کی عشقیہ شاعری سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکے ہیں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا		جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
دشنام یار طبعِ حزیں پہ گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

یاد اس کی گرمیِ صحبت دلاتی ہے بہار
آتشِ گل سے مرا سینہ جلاتی ہے بہار

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو ۔ عذر کچھ چاہیے ستانے کو
صبحِ عشرت ہے وہ نہ شامِ وصال ۔ ہائے کیا ہوگیا زمانے کو

یہ تو تھیں مومن کے ایسے اشعار کی مثالیں جہاں مومن اپنا جواب آپ ہیں۔ اب ذرا غالب اور مومن کے کچھ ایسے شعر بھی دیکھتے چلیے جہاں مضامین میں ہم آہنگی ہے لیکن شعر غالب کا بہتر ہے ؎

نالۂ پیہم سے یاں فرصت نہیں
حضرت ناصح کریں ارشاد کیا ۔ مومن

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا ۔ غالب

روزِ محشر کی توقع ہے عبث
ایسی باتوں سے ہو خاطر شاد کیا ۔ مومن

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے ۔ غالب

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جُدا نہیں ہوتا ۔ مومن

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا ۔ غالب

روز کا بگاڑ آخر جان پر بنا دے گا
ان کو شوقِ آرائش دل ہے بدگماں اپنا — مومن

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز — غالب

اے تند خو آ جا کہیں تیغا کمر سے باندھ کر
کن مدتوں سے ہم کفن پھرتے ہیں سر سے باندھ کر — مومن

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا — غالب

ان نقادوں نے جو مومن کے پرستار ہیں بارہا یہ بات کہی ہے کہ مومن نے صرف عشق کی حدود میں رہتے ہوئے شاعری کی ہے اور عشقیہ شاعری کے تمام امکانات سے غزل کو پہلی بار روشناس کرایا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں بالعموم اور ایک شاعر کی زندگی میں بالخصوص عشق کی کیا اہمیت ہے۔ اس موقعے پر فراق گورکھپوری کی رائے کو دہرا دینا ضروری ہے:

"زندگی کے مرکزی اور اہم حقائق و مسائل غزل کے موضوع ہوتے ہیں۔ ان حقائق میں وارداتِ عشق کو اولیت حاصل ہے کیوں کہ انسانی تہذیب کے ارتقا میں جنسیت اور اس سے پیدا ہونے والی کیفیتوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جنسیت کے اندھے طوفان کو توازن بخشنا یعنی تہذیب جنسیت تاریخ کا بہت بڑا کارنامہ رہا ہے ہم محبوب سے محبت کر کے اور اس محبت کو رچا اور سنوار کے اپنی زندگی کو رچاتے اور سنوارتے ہیں۔ حیات و کائنات سے محبت کرنا سیکھتے ہیں اور زندگی کی دھار کو کند ہونے سے بچاتے ہیں۔ غزل ہمیں

جنسیت کی اہمیت کا احساس کراتی ہے اور جنسیت جب داخلی اور غیبی
تحریکوں سے عشق بن جاتی ہے تو اُس عشق کے لامحدود امکانات کی طرف،
اُس عشق کے ذریعے سے تعمیرِ انسانیت کی طرف غزل اشارہ
کرتی ہے:۵

فراق کا یہ بیان عشق اور غزل دونوں کے نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے۔ اگر فراق کے
الفاظ پر غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ مومن نے یقیناً اپنی غزل کے ذریعے جنسیت کی
تہذیب کی ہے عشق کو اپنی زندگی اور اپنی غزل میں رچایا اور سنوارا ہے لیکن بس یہیں
تک پہنچ کر وہ تھک جاتے ہیں۔ مومن عشق کی ان داخلی اور غیبی تحریکوں سے کام نہیں
لے سکے جو شاعر کو بالآخر حافظ، سعدی، رومی، میر، غالب اور اقبال بناتی ہیں۔ تو کیا اس
اعتبار سے مومن کو ایک ادھورا شاعر کہنا کچھ زیادتی ہوگی!

غالب کا غزل کے میدان میں دوسرا بڑا کارنامہ ان کا اندازِ بیان ہے
مومن کی عشقیہ شاعری کی طرح اس اندازِ بیان کی مثال بھی غالب سے پہلے کہیں
نہیں ملتی اور غالب کے بعد بھی نہیں ملتی۔ مومن نے غزل میں جس مزاج کی طرح ڈالی
تھی اسے تو نسیم، حسرت اور فراق جیسے شاعر پا گئے لیکن غالب کے اندازِ بیان کو آج
تک کوئی چھو کر بھی نہیں گزر سکا۔ بقول آلِ احمد سرور "اس کی عظمت اس کی
انفرادیت میں ہے اور اس کی انفرادیت ایک نیا شاعرانہ سانچا ایجاد کرنے میں ہے"۔
آخر میں غالب کا یہ شعر سن لیجیے ؎

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

حواشی

۱۔ نیاز فتح پوری، کلامِ مومن پر ایک طائرانہ نظر، نگار مومن نمبر کراچی

۲۔ عبدالباری آسی، موازنۂ مومن و غالب، نگار مومن نمبر کراچی
۳۔ ظہیر احمد صدیقی مرتب و مترجم انشائے مومن، غالب اکیڈمی دہلی ۱۹۷۷ء ص ۲۱۲
۴۔ عالم خوندمیری 'مومن اور محبت' یادگارِ مومن : اُردو مجلس حیدرآباد ص/۴۳
۵۔ فراق گورکھپوری، غزل کی ماہیت و ہیئت، نگار اصناف سخن نمبر جنوری ۱۹۵۷ء ص/۴۰

ڈاکٹر رضیہ اکبر

انیسویں صدی کے اُردو فارسی ادب کی دو منفرد آوازیں

غالب کو مومن عزیز تھے اور مومن کو غالب اور مجھے دونوں عزیز ہیں کہ میں ان کو ایک دوسرے کی تکمیل سمجھتی ہوں۔

دونوں کو پڑھتے ہوئے، خاص طور سے ان کی عشقیہ شاعری یا غزل، ان کے انفرادی رنگ نے ذہن میں جو نقوش اُبھارے، یہ اس کا ایک اظہار ہے:

یہ وہ زمانہ تھا جب سرزمین ہند پر بیرونی سوداگروں کے پرچم گڑ گئے تھے کئی صدیوں میں تشکیل پائی بڑی تہذیب کی جڑیں اکھڑ رہی تھیں۔ اُس کا ایک تاریخی سفر تمام ہو رہا تھا۔ حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ ہر طرف ایک دُھندسی چھائی تھی تاہم ۱۸۵۷ء کی خون آشامی سے پہلے کی رُبع صدی میں دہلی اور اس کے آس پاس کی فضا مقابلتاً بظاہر سکون آشنا نظر آتی تھی اور اگرچہ معاشی بدحالی، مایوسی، ڈر اور انا۔ دیشے اندر ہی اندر پورے معاشرہ کو گھن کی طرح کھا رہے تھے مگر بحیثیت مجموعی ابھی مغل دارالسلطنت اور اس کے اطراف کا ادبی ماحول، سیاسی سطح سے قطع نظر، غیر معمولی حد تک آباد و غنی تھا۔ کتنے ہی فنکار و شاعر اس ہنگامہ در آغوش" وقفہ" میں منظر عام پر آئے جن کی

تخلیقات نے اُردو فارسی ادب کے گلستان میں سیکڑوں گلہائے مختلف رنگ کا اضافہ کیا۔ انہی میں دو منفرد آوازیں تھیں جو اپنے تمام ہمعصر شاعروں سے الگ اور اونچی تھیں جن کی گونج ہم آج بھی سُن رہے ہیں۔

۱۹ ویں صدی کے نصف اول کی یہ دو غیر معمولی منفرد عظیم شخصیتیں غالب و مومن جن کو ہم ۱۹ ویں صدی بھی کہہ سکتے ہیں اور عہد ساز بھی۔

ایک ترک نژاد جس کے آباو اجداد کا پیشہ سپہ گری اور اُس کا اپنا مزاج فکر و احساس کا حسین آہنگ۔ دوسرا فردوس بر روئے زمین سے وابستہ خود بھی حسن و خوبی میں یکتا اور مزاج یکسر جمال۔ دونوں ایک ہی عصر کے آفریدہ، ایک ہی سماجی ماحول کے پروردہ لیکن افتادِ طبع مختلف، گھر کی فضا بھی مختلف اور انداز تربیت بھی جدا زندگی کو دیکھنے اور برتنے کا دونوں کا رویہ بھی الگ۔ ایک کے مزاج میں فکر اور نگاہ کی بلندی کے ساتھ پندار ذات اور آدم خاکی کا وقار، دوسرا عاشق مزاج و عشق پیشہ، پندار محبت و وفا کی انفرادیت کا نمائندہ، ایک روش آزاد کا دلدادہ دوسرا ایک مسلک خاص کا گرویدہ ——— مومن اہلِ حکمت و شریعت کا دست نگر اُس کی نظر اپنے دائرۂ دین و عشق میں محصور اور غالب تنگی سے بیزار سعی تحیر کی گرانمایگی پہ نازاں :

نازیم بہ گرانمایگیِ سعی تحیّر   کز سر صدایں دیر خرابم بدر آورد

مومن اپنے ہی دیر خراب میں محو وفا و الفت رہا اور غالب کی وارفتہ نگاہی شورہستی میں دست انسان کی عظمت کو پا گئی :

زما گرم است ایں ہنگامہ بنگر شورہستی را   قیامت می دمد از پردۂ خاکی کہ انسان شد

مومن کا دیدۂ حیراں بھی تماشا کرتا ہے مگر صرف دیدو بازدید تک تماشا سے کہنگی کی برافگنی تک نہیں پہنچتا اور غالب بردم طرحِ نو کی تلاش میں گرم رفتار کہ کہتا ہے :

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم   در بزم رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

غالب کا عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد اور مومن کا عشق وفا کیش کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل جاتے ہوئے کوئی ندامت محسوس نہیں کرتا۔

ایک انداز نو، ایک ادائے تازہ، بہرحال دونوں کا امتیاز خاص۔ دونوں دہلی

کے معزز و معروف آسودہ و خوشحال گھرانوں کے چشم و چراغ ، دونوں کا بچپن بڑی بے فکری اور ناز و نعم میں گزرا دونوں ہی شروع میں بے راہ روی کا شکار بھی ہوئے لیکن غالب کی کچھ تو اپنی فطری سنجیدہ مزاجی اور کچھ صحبتِ خوب اور خاندانی وقار کا پاس، وہ بہت جلد سنبھل گئے اور مومن بھی اپنی شائستہ مزاجی اور خاندانی شرافت اور ایک مسلک خاص سے وابستگی کی بنا پر۔ گو بقول خود ساری عمر عشق بتاں میں کاٹی مگر ضبط اور تہذیب نفس کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ دونوں کے خاندان شان و شوکت، شہرت، علم و حکمت میں مشہور تھے لیکن خود ان کے لیے جو چیز عزت و شہرت کا باعث بنی وہ ان کی شاعری ہے۔ دونوں کو شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی، دونوں کو فارسی زبان پر بھی کامل عبور حاصل تھا۔ دونوں نے فارسی شعر و ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اپنے اپنے احساس و مزاج کے مطابق اُس سے اثرات بھی قبول کیے تھے۔

مومن کو شروع سے بہت باقاعدہ تعلیم ملی، بڑے استادوں اور عالموں نے ان کے ذہن و نظر کی تربیت کی تھی، مختلف علوم کے درس دیے تھے۔ غالب مدرسی قیل و قال سے دور رہے ہے۔ انھوں نے خود اپنے جذبہ و فکر کی پرورش کی اور اپنے نفس شعری کی تہذیب و تربیت میں بڑی ریاضت سے کام لیا۔ فارسی زبان سے ان کو بہت زیادہ لگاؤ تھا اور ان کا فارسی ادب کا مطالعہ غیر معمولی حد تک وسیع اور عمیق تھا۔ متقدمین سے لے کر معاصر عہد تک کے تقریباً سب ہی اساتذۂ سخن کو انھوں نے بڑے غور سے پڑھا تھا اور بار بار پڑھا تھا اور ان کے صحت مند عناصر کو جذب کیا تھا۔ مطالعہ مومن کا بھی وسیع تھا مگر ایک انتخاب خاص کی حدود میں، علم طبابت کے علاوہ فقہ، حدیث اور مذہبی علوم ان کے مطالعہ میں مرکزی حیثیت رکھتے تھے مگر چونکہ ان کے مسلک میں تصوف کی گنجائش نہ تھی لازماً فارسی کی صوفیانہ شاعری کا وافر ذخیرہ ان کی توجہ کو جذب نہ کر سکا۔ دوسرے وہ اتنی کم عمری سے "کاروبارِ شوق" میں مبتلا ہو گئے کہ ان کا زیادہ تر وقت و فورِ شوق و تمنائے محبوب کی ہی نذر ہو گیا۔ غالب کا معاملہ اس کے برعکس تھا کم عمری سے ہی متاہل زندگی کی گرانباریوں نے ان کے مشاغل حیات میں ایک طرح کا نظم اور ترتیب پیدا کر دی تھی اور فکر شعر ہی ان کا واحد "کاروبارِ شوق" تھی۔

حکیم مومن خان مومن کو فن شعر سے اتنا انہماک نہ تھا ان کے لیے شاعری اپنے جذبات

اور کیفیات دونوں کے اظہار کا ایک مشغلہ تسکین تھی اور غالب کے لیے ایک "فن"۔ دونوں کی فنکارانہ زندگی میں بھی بڑا فرق تھا، گو دونوں غیر معمولی خلاق ذہن رکھتے تھے روش عام سے گریزاں اور ندرت اظہار و خیال کے جویا تھے اور دونوں کے پاس ندرت خیال بھی ہے اور جذبۂ عشق کی تپش بھی مگر مزاج کا فرق ہے، ایک ہی کیفیت، ایک ہی قسم کے تجربات کا ذکر ہو تب بھی ایسا لگتا ہے ایک کہیں بہت بلندی سے آواز دے رہا ہے اور دوسرا کہیں قریب بیٹھا بڑی نرم و گداز آواز میں شاید اپنے ہی سے سرگوشی کر رہا ہے۔ تقریباً ایک ہی بات کہنے کے دونوں کے تیور میں بھی جو فرق ہے اس کے اندازہ کے لیے میں یہاں دونوں کے صرف چند شعر پیش کروں گی :

مومن کہتا ہے :

چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی　　　ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

اور غالب کے تیور دیکھیے :

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

ایک کی بات جیسے صرف "اسیر محبت" کے لیے ہے اور دوسرے کی ہر کسی کے لیے۔
مومن کا یہ انداز احتیاط دیکھیے کہ :

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا　　　میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

اور غالب کا یہ انداز بے محابا :

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ　　　شہیدان نگہ کا خوں بہا کیا

اسی طرح یہ چند شعر اور :

میرے مرنے سے بھی وہ خوش نہ ہوا　　　جی گیا یوں ہی رائگاں افسوس

مومن

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں　　　وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

غالب

کیا کیجیے کہ طاقتِ نظارہ ہی نہیں　　　جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں

مومن

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز   آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

غالب

ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا   وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لیے

مومن

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی   اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

غالب

مومن نہ سہی بوسہ پا سجدہ کریں گے   وہ بت ہے جو اوروں کا تو اپنا بھی خدا ہے

مومن

بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب   کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

غالب

قاتل جفا سے باز نہ آیا وفا سے ہم   فتراک میں جو سر ہے تو پا ہے رکاب میں

مومن

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے   نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

غالب

صبح فرقت ہے وہ نہ شام وصال   ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

مومن

وہ فراق اور وہ وصال کہاں   وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

غالب

وہ آئے ہیں پشیماں نعش پر اب   تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

مومن

بہ بالینم رسید حتی زہے بیکس نواز یہا   فدایت یک دو دم عمر گرامی وا رسیدن را

شعر خواہ اُردو کا ہو یا فارسی کا دونوں کے انداز بیان اور تیور کا یہ فرق اسی طرح نمایاں دکھائی دے گا۔ مومن کا ایک فارسی شعر ہے :

یارب چقدر لطف شناسد امیدوار — بر روئے زاہدان در جنت فراز کن

یعنی بند کردے۔ اور غالب کہتا ہے :

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ساتھ میں غالب کا فارسی کا ایک اور پُر شوخ شعر یاد آ گیا وہ بھی سن لیجئے :

یارب بزاہدان چہ دہی خلد رائگاں — جور بتاں ندیدہ و دل خون نکردہ کس

مومن نے اتنی جرأت شاید ہی کبھی کی ہو اور ایک مسلکِ خاص کے پیرو سے ہم اس قسم کی شوخی و ظرافت کی توقع بھی نہیں کر سکتے ۔

دونوں کو اپنی ذہانت پر اعتماد بھی بہت تھا اور احساس فوقیت بھی جس کا دونوں کے پاس بہ انداز مختلف اظہار بھی ملتا ہے ۔ غالب تو یہاں تک کہتا ہے کہ :

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ — چوں من از دودۂ آذر نفساں برخیزد

یہی بات مومن پر بھی صادق آتی ہے مگر فرق یہ کہ غالب کا اعتماد و پندار اُس کی آزاد روش کے باعث بے روک ٹوک آگے بڑھتا گیا مومن کا اعتماد ایک مخصوص مذہبی فرقہ کا پابند بن کر کچھ سکڑ گیا اور اس کا عشق بھی اپنے "حصار" میں بند رہا دونوں اپنے زمانۂ حال سے نا آسودہ نظر آتے ہیں مگر ایک کی نا آسودگی میں اپنی مجبوری عشق اور کچھ شعائر مذہبی کے مٹنے کا غم زیادہ ہے دوسرے کی نا آسودگی میں اپنی تہذیبی اقدار کی پائمالی کا دُکھ اور کرب مضمر ہے ۔

تاریخ کی گردش رفتار کا ادراک دونوں کو تھا۔ ایک آنے والے نظام کی پرچھائیں جو ابھی نقاب پوش دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی ، دونوں ہی اُس کی آواز کو سنتے ہیں مگر بہ انداز مختلف ــــــ مومن کے حکمت آشنا ذہن نے ایک معاشرہ کی شکستگی کا علاج سماجی اصلاح میں دیکھا کیونکہ وہ شروع سے اُس تحریک کے رکن تھے جو بہت پہلے سے چلی آ رہی تھی اور اُن کی "باخبری" "شور کفر" سے گھبرا کر اس خطیبانہ سطح پر اتر آتی ہے کہ :

تا چند بخواب ناز بالش — فارغ ز فغان آفرینش

برخیز کہ شور کفر برخاست　　　اے فتنہ نشانِ آفرینش

غالب کی حقیقت شناس نظر بدلتے ہوئے حالات کی خرابی و ویرانی میں مضمر نئی تعمیر کی صورتیں بھی دیکھتی ہے اُس کی نگاہ ایک "گلشن نا آفریدہ" پر بھی ہے اور اپنی قوم کی کوتاہیوں پر بھی وہ تنگ نظری سے صرف غیروں کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا اور ان کی نادانستہ طور پر سہی دی ہوئی کچھ روشنیوں کا منکر بھی نہیں بنتا اور بڑے اندوہ گیں غم آمیز انداز سے بے خبروں کو آواز دیتا ہے کہ :

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں　　　اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

مومن کی سیاسی باخبری اور جذبۂ ملی کا کم وبیش ان کے سب ہی نقادوں اور مداحوں نے ذکر کیا ہے اور ان کی شاعری سے اس کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مومن کا جذبۂ ملی بڑی حد تک انفعالی نوعیت کا تھا محض ایک کچھ خاندانی ورثہ کی سی بات۔ وہ بچپن سے جس اصلاحی تحریک سے وابستہ رہے اور جس مسلک کی انھیں تعلیم ملی وہ کئی پشت سے خاندان میں چلا آرہا تھا اور مومن شروع سے ان لوگوں کے ہم صحبت اور جلیس رہے تھے جو اس تحریک کے سرگرم رکن تھے اور جس کا دائرۂ عمل محدود تھا چنانچہ مومن کی نظر بھی صرف ملتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود تک پہنچ کر رک جاتی ہے غالب کی اس آگہی تک نہیں پہنچ پاتی کہ :

خوش بود فارغ ز بندِ کفر و ایمان زیستن　　　حیف کافر مردن و آوخ مسلمان زیستن

(کاش یہ آگہی ہماری پوری قوم کا نصیب بن سکے!)

بات "آگہی" کی آگئی تو اس ضمن میں یہ اعتراف حقیقت نامناسب نہ ہوگا کہ تصوف دوسری صدی ہجری سے لے کر آج تک بھی، ایران میں بھی اور ہند میں بھی، کم وبیش ہر دور میں رائج و مقبول رہا ہے اور اپنے اس طویل سفر میں اس نے جتنی اثباتی اور منفی شکلیں اختیار کیں جس سرشاری اور محویت کے دورے گذرا، انسانی وقار کا پاسدار بنا، آفاقی فکر کا علمبردار رہا اور پھر روایت کا شکار بن کر افسردگی، تنگی اور انسانی کم مائیگی کا بھی رخ کیا، فارسی ادب کے وافر ذخیرہ میں خواہ وہ ایران کا ہو یا ہند کا، ہم اس کے ہر رنگ رخ کو

دیکھ سکتے ہیں۔ خاص طور سے غزل کی صنف کو تصوف کے ہزار رنگ وکثیر معنی رمز وکنایات،
اشارات اور علامات نے عہد حافظ تک ادب کی سب سے جاندار ومقبول صنف سخن
بنائے رکھا اور اس کو غیر معمولی وسعت وہمہ گیری عطا کی تھی مگر غالب ومومن کے عہد
تک پہنچتے پہنچتے اس میں بڑی پژمردگی پیدا ہو گئی تھی۔ تصوف کی ابتدائی تحقیق قوتیں بے
جان روایت بن کر رہ گئی تھیں اور اس کا منفی انداز غلبہ پا رہا تھا۔ غالب کی معروضی نظر
نے اس افسردگی کو دیکھا اور اپنی گفتار نو آئیں اور ذہن رسا سے اس کے پژمردہ جسم کو از سرنو
زندگی بخش کر تصوف کے افسردہ ماحول میں بھی ایک نئی فضا پیدا کی۔ بیشک مومن نے
بھی اس میں ایک نئی روح پھونکی مگر بہ انداز دگر۔ بنیادی طور پر دونوں نے اُردو فارسی
غزل کے مروجہ ڈھانچہ کے حدود میں رہ کر ہی فکر واحساس، جذبہ اور انداز بیان وگفتار کی جولانیاں
دکھائیں۔ ایک نے اس سانچہ میں خالص انسانی عشق ومحبت کی کیفیات کے رنگ بھرے،
دوسرے نے تصوف کی پس ماندگی اور افسردگی میں اپنی فکر اور آگاہ نظری سے نہ صرف ایک
نئی فضا پیدا کی بلکہ حیاتِ انسانی کو کیف معنوی اور نشاط کار کی ہماہمی سے بھی آشنا کیا اور
انسانی جذبۂ عشق ومحبت کو بھی ایک کائناتی وسعت کا حامل بنایا۔ اُدھر مومن کے تخلیقی
ذہن نے غزل کی ماورائی نوعیت سے علانیہ بغاوت کی اور ایک بالکلیہ نئی صالح روایت
کی بنا ڈالی۔ مومن نے جس ارضی محبت کو اپنا معروض بنایا دنیائے شعر وادب میں اس کا
یہ اجتہاد ہیں سمجھتی ہوں اُس مذہبی اجتہاد سے بدرجہا وقیع اور نتیجہ خیز ثابت ہوا جو اس
وقت کی مذہبی سماجی زندگی میں ان کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ جذبۂ اجتہاد اُس تحریک
کا پیدا کردہ تھا جسے سید احمد رائے بریلوی نے شروع کیا تھا جس کا مقصد انگریزوں
سے ملک کو پاک کرنا تھا۔ مومن کے اہل خاندان شروع سے اس تحریک سے وابستہ رہے
تھے اور مومن نے بھی نظریاتی حد تک اُس کو اپنایا تھا اور اُن کی شاعری کا ایک بڑا حصہ۔
غزل کو چھوڑ کر۔ اس غیر شاعرانہ ذکر کا حامل ہے۔

اس ولی اللہی مسلک میں تصوف کی کوئی گنجائش نہ تھی اور مومن کے مزاج
میں بھی اُس کی کوئی سمائی نہیں تھی۔ اس کے برعکس غالب کے مزاج کو تصوف کے

فکری اثباتی پہلو سے خاص لگاؤ تھا انھوں نے فارسی کے تمام صوفی شاعروں کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا، اُن کے جذبہ اور فکر کی وارفتگی کے ضمیر تک رسائی حاصل کی تھی حافظ شیرازی کی سرشاری کو اپنے ذہن و مزاج میں سمویا تھا اور خود اپنی نظر میں جو بلندی اور پیش بینی تھی ، خیال کی جو محشر سامانی تھی وہ فکری تصوف کی شاعری میں ہی پوری طرح اپنی جولانی دکھا سکتی تھی یہی وجہ ہے کہ ایک کے ہاں بہت متنوع قسم کی معنویت اور خیالات کی فراوانی ہے دوسرے کے پاس ایک مخصوص نوعیت کے خیالات ، معنویت کم مگر زبان کی چاشنی ، محبت کا گداز ایک انسانی جذبہ اور گفتار خاص کا لطف زیادہ ۔ غالب کسی تحریک سے وابستہ نہیں رہا نہ کسی مسلک خاص کا پابند کہ اس کا یہ اعتقاد تھا :

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست   ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

شاید اسی لیے اُس کی آزاد روشی میں ہم کو حلاج کی نوائے سرفروشی کا احساس ہوتا ہے ۔

عام طور پر دونوں مشکل پسند سمجھے جاتے ہیں اور یہ ایک حد تک درست بھی ہے کیونکہ اس امر سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ فکر و جذبات دونوں ہی بڑی پیچیدہ نوعیت رکھتے ہیں ان کی باریکیوں اور گریز پا حقیقتوں اور کیفیتوں کو گرفت میں لانا آسان نہیں ہوتا اور فکر جتنی بلند سطح ، مطلق آمیز اور ہمہ گیر ہو گی لازماً اتنی ہی اُس کی تہیں بھی ہوں گی ۔ یہی حال جذبات کا ہے ۔ ایک ہی جذبہ کئی متضاد پہلوؤں کا حامل ہو سکتا ہے اور کبھی ایک ہی لمحہ میں قلب انسانی سیکڑوں مختلف اور متضاد جذبات کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور سچ پوچھئے تو ایک عظیم شاعر ہی اُن ساری مبہم کیفیات کو الفاظ میں سمیٹ سکتا ہے اور اُس کی فکر و جذبہ کی تہ تک پہنچنے کا انحصار بڑی حد تک قاری کے اُس کے ذوق و استعداد پر بھی ہوتا ہے ۔ بہر صورت اگر مومن مشکل گو شاعر ہے تو غالباً کچھ جذبات نفس کی پردہ پوشی ، تہذیب ہوس کی سعی اور طرز نو کی تلاش کی بنا پر، تاہم اُس تک پہنچنے کے لیے ہم کو زیادہ ذہنی کاوش سے کام نہیں لینا پڑتا تھوڑے سے تامل سے ہم اس کے مشکل اشعار کے بھی معانی و مفہوم کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں ، پھر اُس کی کیفیات نفسی اور تجربات محبت کو سمجھنے میں کوئی اُلجھن باقی نہیں رہتی لیکن غالب کی بات کچھ اور ہی ہے اس کے بظاہر سادہ اشعار کے ضمیر میں بھی اتنے

معانی پنہاں ہوتے ہیں کہ غور و تأمل سے ایک گرہ کھلتی ہے تو کتنی ہی اور گرہیں نظر آتی ہیں اور ہر بار معنی و مفہوم کی ایک نئی دُنیا سامنے آتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ویسا ہی ذہن رسا چاہیے۔ مومن کے باتیں آسانی سے ہر دل میں گھر کر لیتی ہیں قاری اپنی داخلی حساسیت کی حد تک خود کو بہ آسانی اس سے بہت قریب محسوس کر سکتا ہے مگر غالب کو ہم جتنا پڑھتے ہیں فاصلہ جیسے اور بڑھتا جاتا ہے کیونکہ اُس کی فکر، اُس کا عشق نبرد پیشہ ہر ہر مرحلہ پر طلبگار مرد ہے اُس کی بے چین متلاشی فطرت اور انبوہ خیالات اُسے کسی ایک نقطہ پر رُکنے نہیں دیتا، اُس فکر" تمنا کے دوسرے قدم" کی جستجو میں مستقلاً گرم رفتار نظر آتی ہے، اس کا شوق بے نہایت راہ کے ہزار بتوں کو توڑتا ہے پھر بھی اس ادراک حقیقت کو بھلا نہیں سکتا کہ :

ہر چند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

اُس کا شوق بقول خود اُس کے" در وصل ہم آرام ندارد"

پورا شعر ہے :

بلبل بہ چمن نبگر و پروانہ بہ محفل شوق است کہ در وصل ہم آرام ندارد

مومن محبت کے ایک" حصار" میں گم نظر آتا ہے اُس کا شوق خیال دوست اور تمنائے وصال میں اُلجھا رہتا ہے اُس کا طریق وفا اُسے کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل لے جاتا ہے ایک منزل نہیں بنتا اور غالب کہتا ہے :

ہر ذرّہ در طریق وفائے تو منزلے ہر ذرّہ از محیط خیالت کرانہ ایست

مثال کے طور پر میں یہاں غالب کے صرف چند شعر نقل کروں گی اور اس اعتراف عجز کے ساتھ کہ کئی بار غالب سے بہت قربت محسوس کرتے ہوئے بھی ایسا لگتا ہے جیسے ہنوز اس کی" فکر رسیدہ" پوری طرح گرفت میں نہیں آسکی ہے اور ابھی اس کی کئی گرہیں اپنی کشادگی کے لیے کسی تأمل خاص یا" مے مرد افگن" کی منتظر ہیں : دیکھیے بظاہر کتنے سادہ شعر ہیں مگر.....

باوجودیک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

پیمانۂ رنگیست دریں بزم بگردش
ہستی ہمہ طوفان بہار است خزاں ہیچ

جنت نکند چارۂ افسردگی دل
تعمیر بہ اندازۂ ویرانی مانیست

عالم آئینۂ راز است چہ پیدا
تاب اندیشہ نداری بہ نگاہی دریاب

طول سفر شوق چہ پرسی کہ دریں راہ
چوں گرد فرو ریخت صدا از جرس ما

شوق ہے سامان طراز نازش ارباب عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

پیمانہ را بہ ماتم صہبا نشاند نست
اے وائے گر ز خاک وجودم سبو کنند

صحن چمن نمونۂ بزم فراغ تو
باد سحر علاقۂ ربط حواس کیست

خیال مرگ کب تسکین دل آزردہ کو بخشے
مرے دام تمنا میں ہے اک صید زبوں وہ بھی

مٹتا ہے فوتِ فرصت ہستی کا غم کوئی
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

طوالت کے خوف سے اتنے پر ہی اکتفا کرتی ہوں۔

غالب اور مومن دونوں کے ہاں بہت سے مضامین کم و بیش وہی ہیں جو صدیوں سے غزل کا ایک اہم موضوع رہے ہیں یعنی وہی "حدیث عشق"۔ پھر بھی بقول خود شاعر "از ہر کس می شنوم نامکرر است" اس لیے کہ یہ "حدیث دل" مطلق ہو تو ہر ایک کا مخصوص و لامحدود تجربہ ہے اور غیر مطلق ہو تو بھی ہر فرد کے اپنے تجرباتی احساس کی گوناگوں کیفیتوں کی حامل۔ بقول کسے ہر "جراحت جگر خستگان" کا اپنا جدا رنگ ہوتا ہے وہی نامکرر کی کیفیت کا ضامن بنتا ہے اور جب فنکار کا ذہن و مزاج دونوں روشِ عام سے الگ ہوں تو لازماً اس کا اپنا منفرد رنگ اور چوکھا ہو جاتا ہے۔ اور غالب و مومن دونوں ایسے ہی منفرد ذہن و مزاج کے مالک تھے وہ عام ڈگر پر چلنے والے شاعر نہیں تھے حتیٰ کہ وارداتِ محبت اور رودادِ عشق کے بیان میں بھی دونوں کا رنگ رُخ نمایاں طور پر الگ نظر آتا ہے جیسا کہ اوپر کی چند تقابلی مثالوں سے بھی واضح ہے۔

مومن وہ پہلا شاعر ہے جس نے غزل کو اس کے اصل لغوی معنوں میں استعمال کیا محبت کو ایک ماورائی دنیا سے نیچے اُتارا اور اُسے دو انسانوں کی باہمی فطری محبت کا روپ دیا۔ عشق کے انسانی جذبات و تجربات کو اُس کی ساری نفسیاتی الجھنوں اور کیفیتوں کو بغیر کسی احساس گناہ کے بیان کیا اور تصور گناہ کے اُس بُت کو توڑا جو نہ جانے کب سے اور

کیونکر دو انسانوں کے باہمی ربط کی صلیب بنا ہوا تھا یہی بغاوت مومن کو اُسے اپنے پیشرد اور ہمعصر شعراء میں ایک منفرد آواز کا حامل بناتی ہے اور اس کے موضوع غزل کی یہ نوعیت ہی اُس کی شاعری کو دنیا کی عظیم شاعری کی صف میں لاتی ہے اور حیرت یہ کہ جسمانی عشق اور اس کے تعلق سے مومن کا شعری رویّہ باوجود تصوف کے رمز و کنایات سے یکسر بیگانہ ہونے کے ہمارے جمالیاتی ذوق کی غیر معمولی حد تک تسکین کرتا ہے شاید اس لیے کہ مومن کی غزل سوانحی تجربات کی اس کے حسن و صداقت کی بڑی حسین روداد ہے وہ خود جن کیفیاتی تجربوں سے گزرا وصل و قرب ہجر و فراق اور تمنائے وصال کے لمحات کی جن گوناگوں کیفیتوں کو محسوس کیا ان کا اظہار وہ کچھ ایسے دلکش انداز میں کرتا ہے کہ اُس کی سچائی قاری کے دل کو بھی اپنا شریک بنالیتی ہے۔ واقعی شاید انسانی محبت کا یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ دو چاہنے والوں کے درمیان ان کی انا مستقلاً ایک فاصلہ بنی رہتی ہے مگر سچ پوچھیے تو اسی المیے سے بڑی شاعری جنم لیتی ہے :

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں　　کمبخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

جانے دے چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بلا　　وہ کیوں شریک ہوں مرے حالِ تباہ میں

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے　　ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

دھیان ہے غیر کے تحمل کا　　ہوش دیکھا ترے تغافل کا

لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی　　تو مجھے آزمائے گا کب تک

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

ہے کس کا انتظار کہ خواب عدم سے بھی ہر بار چونک پڑتے ہیں آواز پا کے ساتھ

ذکر اشک غیر میں رنگینیاں بوئے خوں آئی تری گفتار سے

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے

دیکھا نگاہ ناز سے کس شوخ چشم نے پھر مضطرب نظر کو جہاں نیم گام ہے

پامال اک نظر میں ثبات و قرار ہے اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

مومن کے ایسے شعر ہر لحاظ سے دنیا کی عظیم عشقیہ شاعری کا ایک جزو قرار دیے جا سکتے ہیں اور ایسے شعر مومن کے اردو دیوان میں بہت ہیں۔ اس کا "پاس ناموس عشق" "احترام محبوب" "ضبط محبت" تہذیب حیات سکھاتا ہے۔ یہ ضبط محبت غالب کے عشقیہ اظہارات کا بھی امتیاز ہے مگر فرق یہ کہ اس کی واردات قلبی میں بھی اکثر و بیشتر ایک عروضی شعور کا رجحان غالب نظر آتا ہے اور اس کی ہر بات کچھ ایک آفاقی بات بن جاتی ہے۔ غالب انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر جس منفرد انداز سے اپنے خیال کو ظاہر کرتا ہے وہ قاری کو بھی اس کی استعداد کے مطابق نئی نظر دیتا ہے اور ہمارے فکر و خیال کو بھی نئی سمتوں کی طرف موڑتا ہے مومن انسانی زندگی کے صرف ایک پہلو پر۔ کہ وہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اپنے منفرد انداز میں اظہار خیال کرتا ہے اور بیشک اس کی پر خلوص نرم آواز ہمارے جذبات میں بھی ایک لطیف ہلچل سی مچا دیتی ہے ہم اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں مگر وہ ہمیں چونکاتی

نہیں وہ ہمارے دل کے تاروں کو چھیڑتی ہے اُسے آسودگی بخشتی ہے ہماری حساسیت کو بڑھاتی ہے مگر فکر کے لیے مہمیز نہیں بنتی اُسے آسودگی نہیں دیتی اُس کا عشق کسی مرحلہ پر ایک فعال قوت نہیں بنتا اور کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ انسان مستقل طور پر پیہم خالص جذباتی زندگی نہیں گزار سکتا اور خود مومن نے بھی نہیں گزاری یا یوں سمجھیے کہ صرف محبت کرنا اور کیے جانا زندگی کی مکمل حقیقت نہیں ہے فکر و جذبات کی ہم آہنگی سے ہی ایک مکمل زندگی بنتی ہے غالباً اسی لیے مجھے انیسویں صدی کی یہ منفرد آوازیں ایک دوسرے کی تکمیل معلوم ہوتی ہیں۔

فکر سے فکرِ نو کے جتنے چراغ جلتے ہیں اور اُس کی روشنیاں بے روک ٹوک جتنی دُور دُور تک پہنچتی ہیں، ذاتی یا شخصی جذبات عشق و محبت میں یہ تخلیقی قوت کم ہوتی ہے وہ اپنی ”فانوسیت“ میں بند رہتے ہیں ان کی ٹھنڈی روشنی دل کو بہت کیف بخشتی ہے لیکن ذہن کو کم جگاتی ہے۔ غالب کے نشاط تصور کی گرمی اور مومن کے نشاط عشق کی حرارت میں مجھے ایک بڑا فرق یہی دکھائی دیتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ غالب کی فکر و نظر کی دُور رسی اُس کی آگہی ابھی اور بہت دُور تک آنے والے ادوار میں بھی اہلِ دانش کے لیے فکر و تامل فراہم کرتی رہے گی۔

یقیناً مومن کو چاہنے والے بھی اُسے ابھی بہت دنوں تک یاد رکھیں گے اور انسانی حیات کے ایک فطری ازلی جذبۂ محبت کا اُس کا ذکر حسین دلوں کو گرماتا بھی رہے گا اور بہرحال انیسویں صدی کی یہ دو غیر معمولی منفرد آوازیں اُردو فارسی ادب کی تاریخ میں ہمیشہ ممتاز و سربلند رہیں گی کہ دُنیا کی عظیم شاعری کا مقدر ان کا مقدر ہے۔

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی

"انشاے مومن" پر ایک نظر

مومن کی فارسی نثر نگاری کے جو نمونے ہماری دسترس میں ہیں، ان کے لیے ہم کو حکیم احسن اللہ خاں کا شکر گزار ہونا چاہیے جنھوں نے مومن کے مکاتیب اور تقویموں کے دیباچوں کو یک جا کر کے رمضان ۱۲۷۱ھ میں سلطانی پریس دہلی سے "انشاے مومن" کے نام سے شایع کر دیا تھا یہ کتاب ایک مدت سے نایاب تھی۔ اس کی اشاعت دوم پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، جنھوں نے "انشاے مومن" کو دوبارہ مرتب کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مومن کے انتہائی ادق اور مختلف علوم کی اصطلاحات سے پُر فارسی خطوط کا اردو میں ترجمہ کر دیا ہے تاکہ اس کتاب سے وہ لوگ بھی استفادہ کر سکیں جو فارسی زبان سے واقف نہیں ہیں۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا کام اپنی جگہ پر انتہائی اہم ہے مگر افسوس ہے کہ فارسی متن میں کتابت و طباعت کی ایسی غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی وجہ سے اس کتاب سے استفادہ کرتے وقت بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا حکیم احسن اللہ خاں کی مرتب کردہ انشاے مومن نایاب ہے اس لیے درجِ ذیل سطور میں "انشاے مومن" کا جو مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے وہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کے مرتب کردہ متن پر مبنی ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کتاب کو مرتب کرنے کے لیے حکیم احسن اللہ خاں نے زیادہ کدو کاوش نہیں کی اور غالباً یہ بات ان کے پیشِ نظر تھی ہی نہیں کہ مومن کی ہر فارسی تحریر

محفوظ ہوجائے۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے ان تمام خطوط تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جو وقتاً فوقتاً مومن کے قلم سے نکلے تھے۔ خود ان کے نام مومن کے جو خطوط اس مجموعے میں شامل ہیں ان کے مطالعے کے بعد یہ گمان ہوتا ہے کہ انھوں نے مومن کے تمام خطوط نہیں شایع کیے ہیں بلکہ جن خطوط کی انشا ان کو پسند آئی انھی کو انھوں نے اپنے مجموعے میں شامل کرلیا ہے۔ اس طرح مومن کی بہت سی تحریریں پردۂ گمنامی میں چلی گئیں جو اگر محفوظ رہ جاتیں تو ان کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہوتیں۔

یہ تحریریں جس دور کی یادگار ہیں وہ اگرچہ مغلیہ حکومت کے زوال کا دور ہے تاہم علم وادب کی پیشرفت کسی نہ کسی شکل میں جاری تھی۔ شیفتہ، صہبائی، غالب وغیرہ فارسی نثر ونظم کی خدمت میں نہ صرف مشغول تھے بلکہ ان میں سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر ایک الگ اسلوب بیان کا مالک بھی تھا۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں تاہم یہ کہے بغیر چارہ بھی نہیں کہ اگر مومن کی فارسی تحریروں کا غالب کی تحریروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ غالب کی فارسی نثر ایرانیوں کے طرز پر لکھی گئی ہے جس میں ان کا اپنا آہنگ اور اسلوب بیان بھی شامل ہے۔ اپنی فارسی تحریروں میں غالب نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ان کے یہاں عربی الفاظ اور فقرات کا کم سے کم عمل دخل ہو اور جہاں تک ہوسکے وہ خالص فارسی زبان میں اپنی تحریر لکھیں۔ اسی خالص فارسی نویسی کے شوق میں، وہ دساتیر کی طرف مایل ہوئے جو ان کے نزدیک خالص فارسی زبان کا ایک نادر نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں بہت سے ایسے دساتیری الفاظ کا استعمال ملتا ہے جن کو سمجھنا عام فارسی دانوں کے لیے ممکن نہیں۔ اس کے برعکس مومن کی جو فارسی تحریریں دستبرد زمانہ سے بچ گئی ہیں ان کا انداز تحریر یہ ہے کہ وہ بلا تکلف عربی الفاظ وفقرات، کلام پاک کی آیات، مختلف علوم وفنون کی ادق فنی اصطلاحات کو اپنی فارسی تحریروں میں اس طرح جڑ دیتے ہیں کہ ان کے تصور کے بغیر مومن کی فارسی تحریر کا تصور ممکن نہیں رہتا۔

"انشائے مومن" میں مومن کی جتنی بھی فارسی تحریریں جمع کی گئی ہیں ان میں تقریباً

کے دیباچوں کو چھوڑ کر کسی بھی تحریر پر تاریخ نوشت لکھنے کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ ہمارے لیے اس وقت یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ مومن کا خاص انداز ہے یا حکیم احسن اللہ خاں نے "انشائے مومن" مرتب کرتے وقت تاریخوں کو نقل کرنے کا اہتمام نہیں کیا، جس کی وجہ سے بین السطور سے یہ نتیجہ نکالنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کی کون سی تحریر کس سنہ سے تعلق رکھتی ہے۔ صرف چند خطوط ایسے ہیں جن میں بعض تاریخی وقوعات کی طرف مبہم سے اشارے کیے گئے ہیں جن کی مدد سے ان خطوط کا سنہ تحریر تعین کیا جا سکتا ہے ان کی بقیہ اور تمام تحریروں کے بارے میں اب ہم کوئی حتمی اور قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ تحریریں کس زمانے سے متعلق ہیں۔

مومن کے تقریباً سب تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ ان کو سید احمد شہید رائے بریلوی کی تحریکِ جہاد سے بڑا تعلق خاطر تھا اور وہ مسلکاً انھی عقاید کے حامل تھے جو سید صاحب اور ان کے رفقا کے عقاید تھے۔ ان کے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے کلام کے مطالعے سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ان کا ذہنی جھکاؤ سید احمد شہید رائے بریلوی کی تحریکِ جہاد کی طرف تھا اور قولاً وہ اس تحریک کو برحق سمجھتے تھے۔ ان حقایق کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم ان کے فارسی خطوط کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ "انشائے مومن" میں محفوظ ان کے کسی خط میں سید احمد شہید یا ان کے رفقا کے بارے میں ایک بھی جملہ نہیں ملتا۔ غالباً ایسا تو نہ ہوا ہو گا کہ مومن نے نثر میں سید صاحب یا ان کے رفقا کے بارے میں اپنے دلی جذبات کا اظہار نہ کیا ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مومن نے تحریکِ جہاد کے سلسلے میں جو فارسی خطوط لکھے ہوں گے وہ یا تو حکیم احسن اللہ خاں کو مل ہی نہ سکے یا پھر ایسا ہوا ہو گا کہ تحریکِ جہاد کی ناکامی کے بعد بچے کھچے مجاہدین پر انگریزوں نے جس طرح مظالم ڈھائے ان کو مدنظر رکھتے ہوئے حکیم احسن اللہ خاں نے کوئی خط "انشائے مومن" میں شامل نہیں ہونے دیا جس میں سید احمد شہید یا ان کے رفقا کے بارے میں اظہار خیال ہو۔ بہرحال صحیح بات جو کچھ بھی ہو ان خطوط میں سید صاحب اور ان کے رفقا کا ذکر نہ ملنے کی وجہ سے ان تحریروں کے ذریعے ہم مومن کے ان

خیالات سے واقف نہیں ہو سکتے جن کا تعلق سید صاحب اور ان کی جماعت مجاہدین سے تھا۔

جیسا کہ خود حکیم احسن اللہ خاں نے صراحت کر دی ہے۔ "انشائے مومن" میں مومن کے جو خطوط محفوظ کیے گئے ہیں وہ دو متضاد اسالیب بیان کے حامل ہیں۔ ایک اسلوب بیان تو وہ ہے جس میں صناعی ہے، اصطلاحات کے استعمال کی بھرمار ہے اور بات کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر کہنے کی کوشش کہیں کہیں پر قوافی کا بھی التزام ملتا ہے۔ اس انداز بیان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شخص ظہوری کے اسلوب تحریر کو سامنے رکھ کر خامہ سائی میں معروف ہے دوسرا اسلوب بیان اس کے بالکل برعکس علمی اور فنی اصطلاحات کے استعمال سے پاک بھی ہے اور راست انداز بیان کا حامل بھی۔ اس طرح کی تحریروں میں نہ تو لفظی صناعی سے کام لیا گیا ہے اور نہ بات کو پیچیدہ طریقے سے کہنے کی کوشش ہی ہے۔ یہ سیدھے سادے فارسی خطوط ہیں جو اس لیے لکھے گئے ہیں کہ مکتوب الیہ، مکتوب نگار کی تمام باتوں کو بغیر کسی کد و کاوش اور دقت کے سمجھ لے اور اس کے مفہوم تک پہنچ جائے۔ "انشائے مومن" کا تیسرا حصہ تقویموں کے دیباچوں پر مشتمل ہے۔ ان دیباچوں کے ابتدائی حصے تو ایسے ہیں کہ جب تک کوئی شخص نجوم کی تمام اصطلاحات پر حاوی نہ ہو اس وقت تک اس کے لیے ان کا مکمل طور پر سمجھنا بہت دشوار ہے مگر جہاں جہاں انھوں نے پیش گوئیاں کی ہیں ان کا سمجھنا نسبتاً آسان ہو گیا ہے۔ مثلاً ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ عیسوی کی تقویم کے دیباچہ میں انھوں نے جو پیش گوئیاں کی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

> "حکام کشمیر جنت نظیر از وفور بیداد و ستم عذاب دوزخ وا نمایند و جاگزینان آن سرزمین بابطال مذہب فلاسفہ کہ از خلا انکار با دارند زبان صدق بیان برکشایند۔ دار القرار قندھار نمونۂ آشوب گاہ رستاخیز "یفر المرء من اخیہ و امہ و ابیہ" گردد۔ و دار السلطنت ہرات طرب گاہ چغد و بوم شود مشرقیان از تشویش و تلاش اخبار و سوسہ فرا بحال خود و مانند"

جنوبیان از تاراج و باد غارتِ قحط سال دشتِ قبچاق را آبادی مصر و بغداد مثل گردانند و هم از کلکته تا مرشد آباد شیوعِ چیزهای موحش و متوحش آثار پریشانی رو دهد و مردم از شدت ہلاکت و و باطن مالوف به ملک الموت واگزارند و جانِ شیرینِ نازنین بحکیمِ جان آفرین باز سپارند . . .
. . . مسافرانِ ہرزہ تاز و بیابان گرد به بی نوائی و حرمان نصیبی عمر عزیز را گذارند که به صد حسرت و اندوه روزی به شب و شبی بروز آرند .
مسند نشین رسد بند و اطبای حذاقت پسند روی بہروزی نه بینند و منشیان بلاغت شعار و شعرای جادو گفتار بر درِ ناکسانِ ہیچ میز نشینند . امراض جان ربا از فساد خون و احتراق بلغم چون جیچک و مالیخولیا و قطرب . . . و دوران سر عارض شوند و رای طبیبانِ نکته یاب اصابت قرین و مداوا آفرین نه باشد . . .“ (ص ۱۸۶ ، ۱۸۷)

نامناسب نہ ہوگا اگر ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۵ء کی تقویم کے دیباچے سے بھی ایک اقتباس نقل کر دیا جائے ۔ اس دیباچے میں مومن کی پیش گوئی کا انداز بیان یہ ہے :

”خاک جنوب که مہبطِ گوناگون بلا و آزار است و مغرب و شام که جلوه گاہِ روز سیاه و شب تار است ، بر طرف افتادنِ سلطان روم بایکی از ترکانِ متغیر الحال پیداست و اعانت و امداد فرمانروای روس از استیلای شمس ہویدا ، باین ہمه چشم زخمی بلشکر پاشش رسیدنی است و آزار ہزیمت و آسیبِ تطاول و تاراج کشیدنی ۔ پایانِ کارزار نصرت و ظفر تمفت لشکر اسلام است و نکبت و ادبار متاعِ بازماندۂ کفرۂ نافرجام ۔ سیومین فصل تنبیه و تادیب ردسیان ہم تواند نمود و در عیش و شادمانی بر روی اولیای دولت خواہد کشود ۔ خاقان نیز از خون ریختن بحرِ اخضر را رنگین سازد و فغفور ہم صحرای ختن را نگار خانۂ چین ۔

۵ سورہ عبس (۸۰) آیت ۳۴ ، ۳۵ ، ۳۶ ۔

ملکِ انگریزی فراخ تر گردد و سعادت و اقبال از اعدا بر گردد۔ فی الجملہ ہر فتنہ کہ برخیزد قامت نیاراستہ بر خاک نشیند و ہر گردن کشی کہ باسرفرازی در ستیزد و از سرکین برنخاستہ بگوشۂ خمول جا گزیند۔۔۔۔؛

درج بالا دونوں اقتباسات میں مومن نے جو زبان استعمال کی ہے اس کو گلستان یا قابوس نامہ کے انداز کی راست اسلوب بیان کی سیدھی سادی مگر مطالب سے پُر نثر تو قرار نہیں دیا جا سکتا تاہم یہ زبان اتنی پیچیدہ اور تلمیحات و استعارات سے گرانبار بھی نہیں ہے کہ اس کا سمجھنا دشوار ہو۔ زبان کے وصف سے قطع نظر درجِ بالا دونوں اقتباسات اس لیے بھی نقل کیے گئے ہیں کہ مومن کی پیش گوئیوں کے جو نمونے ہم تک پہنچے ہیں، تاریخ کی روشنی میں ان کا مطالعہ کر کے یہ دیکھا جائے کہ مومن کے یہ احکام کس حد تک درست ثابت ہوئے؛ صرف یہی نہیں بلکہ ان تقویموں کے دیباچوں کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ ان میں مومن نے پیش گوئیاں کرتے وقت یہ بھی احکام لگائے ہیں کہ کون سی سماجی بُرائی کس حد تک بڑھے گی اور اس کے بڑھنے کا انداز کیا ہوگا؟ اس سلسلے میں ان تقویموں کے وہ حصے خاص طور سے سماجیات کے طالب علموں کے لیے قابل مطالعہ ہیں جن میں مومن نے یہ حکم لگایا ہے کہ اس سال جنسی کجروی کا فلاں طریقہ ترقی کرے گا اور یہ کجروی پورے معاشرہ کو اپنے لپیٹ میں لے لے گی۔ مومن کا کوئی بھی دیباچہ اس طرح کے احکام سے خالی نہیں۔ اس طرح مومن کی فارسی نثر کا مطالعہ صرف ادب کے طالب علموں ہی کو نہیں بلکہ تاریخ اور سماجیات کے طالب علموں کو بھی دعوتِ نظر دیتا ہے کہ وہ مومن کی ان تحریروں کا تحلیل و تجزیہ کر کے تاریخ اور سماجیات کے بعض تاریک گوشوں کو منور کر لیں۔ ادب کے نقطۂ نظر سے درج بالا دونوں اقتباسات انیسویں صدی عیسوی کی ہندوستانی فارسی نثر نویسی کے ایسے نمونے ہیں جن کے مطالعے کی مدد سے ہندوستان میں فارسی نثر نویسی کی سمت و رفتار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ان مختصر معروضات کے بعد اب ہم مومن کی مکتوب نگاری کا ایک سرسری سا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ انشائے مومن' میں ان کے جو خطوط محفوظ ہیں وہ تقریباً سب کے سب

ذاتی نوعیت کے ہیں۔ ان خطوط میں نہ تو کسی ادبی یا علمی مسئلہ پر بحث ملتی ہے نہ اپنے معاصرین کی شخصیت یا کلام پر کوئی اظہار رائے ہی۔ اس کے باوجود ان خطوط کی مدد سے مومن کے انداز فکر کی ایک واضح اور روشن تصویر مرتب کی جا سکتی ہے اور اس بات کا بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ بیماری کے زمانے میں ان کی ذہانت اور جودتِ طبع کس قدر جولانی پر آجاتی ہے اور ان کا لہجہ کتنا تلخ ہو جاتا ہے۔ بعض بعض خطوط میں انھوں نے اپنی بعض مزاجی کیفیات کی طرف بھی اشارے کیے ہیں جن کی مدد سے ان کی نظم و نثر کی شعلہ بیانی کا نئے نقطۂ نظر اور انداز سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک خط میں انھوں نے اپنی موروثی زمین کے بحق سرکار ضبط ہونے کا بھی ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے انگریز حاکم کے خلاف جو سخت الفاظ استعمال کیے ہیں وہ ان کی مخصوص طبیعت کی غمازی کرتے ہیں۔ غالباً مزاج کی یہی جھنجھلاہٹ ہے جس کی بنا پر وہ ان خطوط میں بلا تکلف ایسی نا ملایم بلکہ گندی باتیں بھی لکھ جاتے ہیں جو بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بھی زبان پر نہیں لائی جا سکتیں۔ اس کا سب سے نادر نمونۂ انشائے مومن کے پہلے ہی خط میں ملتا ہے جس میں انھوں نے اپنے دشمنوں کے جسم کے ایک عضو کو پھاڑ ڈالنے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح ان خطوط کے مطالعے سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ مومن کو طبقاتی کشمکش کا بھی احساس تھا اور انھوں نے جگہ جگہ اس بات کی شکایت کی ہے کہ زمانہ ہنرمند کی کوئی قدر نہیں کرتا اور بدقماش و بدمعاش افراد کی سرپرستی سے اس کو عار نہیں ہے۔ ابھی تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اُس کی تصدیق کے لیے صرف یہی ایک مثال کافی ہوگی۔

"از قدر ناشناسی و سخن نافہمی ہیچ کسم خریدار نیست۔ و جواہر زواہرم را بشبرنگی روزِ بازاری۔ گردِ کساد آں قدر نشستہ کہ طوفانِ نوح از متاعِ تختہ بندمن تواند بردن۔ و زنگارِ ناروائی آنچناں نہ بستہ کہ غبار صرصر عاد آئنہ ام را بجلا خواہد آوردن۔ یوسفم را بہ کلاوۂ پیرزالِ نمی خرند از چاہِ کنعانی بسیم قلب نمی برند۔ با اعجازِ ید بیضا تہی دستم و بادم عیسوی آزار

پرتیم صحیفۂ کمالم را اگرچہ نگاشتۂ قلم قدرت است سامری کیشان نہ پسندند و ناکسانی را کہ مصداق عجلاً جسداً لہ خوار اند بہ زرمی سنجند موی شگافیم برریش بہ دُر گرفتۂ فرعون رشک یاد ارد و باریک بینیم بہ حسرت سرمۂ شداد ہمہ اشک یاقوت رنگ می بارد۔ بااین ہمہ ہیچ میرزی آبروی ہنر نہ فروختہ ام وچشم بر آستین گوہرین دامنان نہ دوختہ۔ بہ نان جوین ساختہ ام و نظر بہ خلۂ آسمان نینداختہ۔ شال پوشیم بہ اطلس افلاک نہ پردازد و خاک نشینیم بذات الکرسی تکیہ نہ سازد۔ اما چہ توان کرد اگر روزگار انصاف این قدرہم دیدن نہ تواند و زمانۂ پایہ ناشناس از بستر خاک نیز پایۂ فروتر نشاند۔ تازہ ستمی کہ سپہر کین دشمن نمودہ این ست کہ کف خاکی از ورثۂ مادری داشتم بہ ترکتازی صرفہ در ربودہ۔" (ص ۳۶۔ ۳۷)

ان چند سرسری اشارات سے اس بات کا اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مومن کی فارسی نثرنگاری ہمارے عمیق مطالعے کی مستحق ہے۔ یہ مطالعہ صرف مومن کی ادبی کاوشوں ہی کی تفہیم کے لیے مفید و معاون نہ ہوگا بلکہ عصر غالب کے ادبی رجحانات کا عرفان حاصل کرنے کا بھی وسیلہ بنے گا۔

ڈاکٹر کامل قریشی

مومن غزل کے نئے آہنگ کا شاعر

مومن خاں مومن اپنے عہد کے باکمال شعرا میں منفرد حیثیت کے مالک ہیں غالب جیسی عظیم شخصیت کی موجودگی میں ان کا اپنی انفرادیت کو بلندی پر برقرار رکھنا اس عہد کی تاریخ کا ایک بڑا واقعہ ہے جسے مومن کی شاعرانہ عظمت کو سمجھنے کے لیے پیش نظر رکھنا ضروری ہے یوں تو مومن نے جملہ اصناف سخن یعنی غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، واسوخت، رباعیات و قطعات میں طبع آزمائی کر کے اپنی شاعری کا بھرپور حق ادا کیا ہے لیکن غزل ان کا خاص میدان ہے اور غزل بھی وہ جس میں تغزل بدرجۂ اتم موجود ہے جسے مومن کے یہاں روح شاعری کا درجہ حاصل ہے مولانا ضیا احمد بدایونی کے الفاظ میں "نفس غزل میں مومن اپنے تمام ہم عصروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ غزل میں اگرچہ حیات و کائنات کے مسائل بیان کرنے کی گنجائش ہر طرح موجود ہے اور شعرا نے اس میں نرم و نازک مضامین سے لے کر عظیم سے عظیم تر باتوں کا اظہار کیا ہے فلسفہ، تصوف، حکمت، اخلاق اور زندگی کے گوناگوں پہلوؤں پر شعرا نے روشنی ڈال کر غزل کے دامن کو وسیع سے وسیع کیا ہے لیکن مومن کے یہاں معاملہ کچھ اور بھی ہے انھوں نے غزل کو جن احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے وہ عشق و عاشقی کے معاملات ہیں ہجر و وصال کے قصے ہیں معشوق سے سیدھے سادے انداز میں گفتگو ہے عشق کی وارداتیں ہیں جن میں آپ بیتی کا انداز ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ غزل کو غزل کی حدمیں رکھتے ہوئے "گفتن با زناں یا حکایات از جوانی و حدیث عشق زناں" کی تصویریں ہیں جو غزل کی معنویت کو لے کر مومن کے یہاں ابھرتی

ہیں اور دل نشیں ہو جاتی ہیں مومن کی زندگی میں کئی عشقوں کا ذکر ملتا ہے اور وہ بھی پردہ نشینوں کے ساتھ، تجربات عشق سے دوچار ہو کر اُن کو جو مزے ملے اور وہ اس راہ پرخار میں جس طرح مردانہ وار چلے اس لیے بھی میدانِ عشق میں اُن کے مشاہدات ذاتی و عمل تھے جس کے نقوش اُن کی غزلوں میں اُبھرآنا بھی ایک فطری عمل تھا چنانچہ اسی لیے غزل میں انھوں نے صرف عشقیہ شاعری کو جگہ دی ہے اور دوسرے مسائل کو اس صنف میں زیادہ توجہ نہیں دی اس سبب سے اُن کی غزل کی فضا ایک خاص تاثر پیدا کئے بغیر نہیں رہتی یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں تخیل کی رنگینی اور جذبات کی فراوانی ملتی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا بیان محل غور ہے۔

> "مومن: فلسفے کے مبلغ ہیں نہ اخلاق کے پرچار کرنے والے اپنی غزل میں وہ صرف ایک شاعر اور ایک آرٹسٹ نظر آتے ہیں اُن کی شخصیت میں انفرادیت، اُن کے تخیل میں رنگینی اور اُن کے جذبات واحساسات میں رعنائی ہے یہی انفرادیت اور رنگینی و رعنائی اُن کی غزلوں میں ایک بھرپور اور رچے ہوئے انداز میں نظر آتی ہے۔"

مومن کی غزل کی ایک نمایاں خصوصیت اُن کی داخلیت ہے جس کی چھاپ اُن کے قصائد و مثنویات پر بھی موجود ہے یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایک طرف دہلی میں شاہ نصیر اور لکھنؤ میں شیخ ناسخ جیسے اساتذہ خارجی شاعری کے میدان میں پیش پیش تھے اور پھر مومن و غالب بھی اسی رنگ میں رنگ گئے تھے تو اس وقت مومن ہی تھے جنھوں نے کچھ قدرے ناسخ کی راہ پہ چل کر اپنی طرز الگ نکالی اور اپنی امتیازی شان کو منوایا نمونہ ملاحظہ:

کیوں کر یہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے　　کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

مومن ــ شخصیت و فن۔ ظہیر احمد صدیقی ص ۱۶۲، ۱۶۳

دامن اُس کا جو ہے دراز تو ہو   دست عاشق رسا نہیں ہوتا

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی   آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا تو میں کیا کرتا   کہ ہر ہر بات پہ ناصح تمہارا نام کہا تھا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے   ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ مومن نے اپنی غزل کو تمام تر مضامین کو تغزل سے بھر دیا ہے اور اُن کی جدت پسندی نے ان حدود میں بھی تنوعات کی وسعتوں کو جنم دیا اُنھوں نے مختلف غیر ضروری روایتی مضامین غزل کو اپنے یہاں جگہ نہ دیتے ہوئے تصوف کو بھی اپنے مسلک کے خلاف تصور کیا اور غزل کو خالص مضامین حسن وعشق تک ہی محدود رکھا وہ چونکہ عاشق مزاج او رشاہد باز تھے عاشقی اُن کا مسلک تھا او رمجاز خاص میدان، چنانچہ اس میدان میں اُن کو جن چیزوں سے سابقہ پڑا ہوگا وہ فراق ووصال نشاط وغم، وفا وجفا، بیم یار، رشک دشمن او رطعنۂ اغیار کے علاوہ اور کیا ہوگا چنانچہ اُن کی غزل کو ان چیزوں کے آئینے میں دیکھنا ہی اُن کا صحیح مطالعہ ہوگا ان چیزوں کے علاوہ ان سے کسی اور بات کا مطالبہ کرنا اُن کے ساتھ انصاف نہ ہوگا تغزل کی اصل خصوصیت اگر شعریت ہے تو یہ بات مومن کے یہاں بڑے خاص انداز جلوہ گر ہے اُن کی غزل میں بیشتر جگہ شعریت اپنے بھر پور جمالیاتی شعور کے ساتھ موجود ہے ملاحظہ ہو :

رقیب کھائے قسم تو وفا کا آئے یقیں   تو میری جان ہے کیا تیرا اعتبار مجھے

ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے   صیاد کی نگاہ سوئے آسماں نہیں

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی   آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ　　　غش تمھیں دیکھ کر نہ ہو جائے

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی　　　ناصح یہ بندِ غم نہیں، قیدِ حیات ہے

مومن کا معشوق پردہ نشیں ہے وہ صنفِ نازک کی زلفوں کے اسیر ہوئے اُن کا عشق فطرت کے مطابق اور پوری صداقتوں کے ساتھ ہماری نگاہ کے سامنے عملی طور پر جلوہ گر ہوتا ہے جس کا عکس اُن کی مثنویوں میں اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ ملتا ہے اور جس کے مرقعے اُن کی غزلوں میں بھی بکھرے پڑے ہیں اُن کے اشعار میں یہ پردہ نشین بار بار بے پردہ ہوتا ہے جس سے مومن کے عشق پر روشنی پڑتی ہے :

ہجر پردہ نشیں میں مرتے ہیں　　　زندگی پردہ در نہ ہو جائے

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں　　　ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں　　　تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

غیروں سے وہ جو پردہ نشیں کیوں نہ بے حجاب　　　دم ہائے بے اثر مرے پردہ اُٹھا گئے

مرگ نے ہجراں میں چھپایا ہے منہ　　　لو منہ اُسی پردہ نشیں کا کیا

ڈاکٹر یوسف حسین خان کے الفاظ میں "اُنھوں نے اپنی غزل کو مجازی عشق کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس کی حدود سے آگے بڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی :

مومن کی طبیعت میں چونکہ اپنی راہ آپ نکالنا، اپنے اندازِ فکر پر عمل کرنا اور اپنی طرزِ سخن پر چلنا موجود تھا اس لیے اُنھوں نے شاعری میں تقلید کو روا نہیں رکھا اور اپنے عشق کی طرح اپنی غزل کو بھی روایتی انداز کے قریب نہ جانے دیا اس سلسلے میں اُن کو صاحبِ طرز ہونے کا درجہ حاصل ہے وہ مقلد نہیں مُوجد ہیں اس لیے غالب، حالی، شیفتہ اور آزاد کے علاوہ آج تک کے ناقدین

نے اُن کے کمالِ فن کی داد دی ہے اور شاعری میں اُن کی امتیازی حیثیت کو تسلیم کیا ہے مومن کے وہ مشاہدات و تجربات جن کی آئینہ دار اُن کی شاعری ہے اور اُن کا وہ رنگ جو اُن کی انفرادیت کا حامل ہے وہ زیادہ تر اُن کی نازک خیالی اور جدت طبع کے حسین امتزاج سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔
مولانا حالی فرماتے ہیں :

"مومن خاں مرحوم اس خصوصیت میں (نزاکتِ خیال) میں مرزا سے بھی سبقت لے لے گئے ہیں[1]"

اسی سلسلے میں صاحب گُلِ رعنا بھی رقمطراز ہیں :

"مومن نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے وہ اُن کی ذہانت اور جولانی طبیعت کا تماشا گاہ ہے انداز بیان کہیں کیفیت سے خالی نہیں[2]"

اِن ناقدین کے خیالات کے علاوہ خود مومن کے یہاں اپنی بھرپور انفرادیت اور صاحب طرز ہونے کا شعوری احساس ملتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص اندازِ بیان، نزاکتِ خیال، طرزِ ادا اور نئے رنگِ تغزل کی خوبیوں پر نظر رکھتے تھے ان باتوں کے اشارے اُن کے اکثر مقطعوں میں ملتے ہیں تعلّی سے قطع نظر اگر مقطعوں کے مضامین پر غور کیا جائے تو اس شعوری احساس پر روشنی پڑتی ہے ملاحظہ ہو :

اپنے انداز کی بھی ایک غزل پڑھ مومن ۔ آخر اس بزم میں کوئی تو سخنداں ہوگا

اپنے ڈھب کی کیا پڑھی اک اور مومن نے غزل ۔ دو ہی دن میں یہ تو کیسا ماہرِ فن ہو گیا

حق تو یہ ہے کیا غزل اک اور مومن نے پڑھی ۔ آج باطل سارے اُستادوں کا دعویٰ ہو گیا

ایسی غزل کہی ہے کہ جھکتا ہے سب کا سر ۔ مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

---

[1] یادگارِ غالب ص ۱۲۲ ۔ [2] جلوۂ خضر ص ۲۳۰

اک اور پڑھو وہ مومن شعلہ زباں غزل　　جل جائیں جس کے اشک سے حاسد بیانِ شمع

غزل سرائی کی مومن نے کیا کہ رشک سے آج　　چمن میں سینے عنادل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

سُن رکھو سیکھ رکھو اس کو غزل کہتے ہیں　　مومن اے اہلِ فن، اظہار ہنر کرتا ہے

غزل کے ان قطعوں میں اپنے انداز، اپنے ڈھب، ایسی غزل، شعلہ زباں غزل، غزل سرائی اور اس کو غزل کہتے ہیں کے الفاظ پر غور کرنے سے اندازہ ہو سکے گا کہ مومن کے یہ اشارے غزل کے اپنے مخصوص انداز کو بھانے اور اپنی طرزِ ادا پر توجہ دلانے کے لیے ہیں یہ انداز، یہ ڈھب، شعلہ زبان غزل اور ایسی غزل سرائی کی تھی اس کا پتا لگانے کے لیے ہمیں مومن کی غزلوں سے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ان غزلوں میں جن محاسن کی رنگا رنگی ملتی ہے ان میں نزاکتِ خیال اور جدتِ ادا کے علاوہ رمزیت بھی اپنی بھرپور شان کے ساتھ موجود ہے۔

اے قیامت نہ آئیو جب تک　　وہ میری گور پر نہ ہو جائے
میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ　　تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

کہا ہے غیر سے تم نے مرا حال　　کہے دیتی ہے بے باکی ادا کی

اس کے ساتھ مومن کے عشق کا زمانہ حسینوں کے جھرمٹ میں رہنے ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے اور اغیار کے ساتھ لاگ ڈانٹ میں گزرا ہے اس کی جھلک ان کی غزلوں میں بھی بڑے خاص انداز سے ملتی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہم حال کہے جائیں گے سُنیے کہ نہ سُنیے　　اتنا ہی تو یاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے

مشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے　　میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

توبہ گنہِ عشق سے فرمائے ہے واعظ　　یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

رحم کر خصم جان غیر نہ ہو ۔۔۔ سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق ۔۔۔ ناصح ہی کو ہے آ اگر افسانہ خواں نہیں

معاملہ بندی کے تذکرہ کے وقت یہ بات کہہ دی جاتی ہے کہ مومن جرأت کے رنگ میں رنگے ہوئے ملتے ہیں لیکن اس میں حقیقت اس وجہ سے نہیں کہ مومن اور جرأت کے مزاج، طرز فکر اور ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے جرأت معاملہ بندی میں بہت کھل کھیلے ہیں مومن نے بہت سنبھل کر اور بڑی ہوشمندی کے ساتھ اس میدان میں قدم رکھا ہے صفیر بلگرامی کا بیان ہے :

> "جرأت اس رنگ کے موجد تھے مگر بہ سبب کم علمی کے بہت کھل گئے تھے مومن خاں کے علم نے ان واقعات کو شکل بندشوں اور نرالی ترکیبوں سے ایسے پردے میں دکھایا کہ ادا شناس ہی اس کے مزے کو جانتا ہے[۱]"۔

مثال کے طور پر مومن کی معاملہ بندی ملاحظہ ہو :

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے ۔۔۔ منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

ہم نکالیں گے سن اے موج ہوا بل تیرا ۔۔۔ اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں ۔۔۔ سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن ۔۔۔ آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

خاک میں مل جائے یارب بیکسی کی آبرو ۔۔۔ غیر میری نعش کے ہمراہ روتا جائے ہے

مومن اور جرأت کی معاملہ بندی پر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کا یہ بیان قابل غور ہے :

---

[۱] جلوۂ خضر ص ۲۴۰

"جرأت کا معیار عامیانہ ہے اُن کے کلام میں اور پھکڑپن میں صرف چند ہی قدم کا فاصلہ رہ جاتا ہے ممکن ہے اُن کا کلام نوجوانوں اور بوالہوسوں کے دلوں کو لبھاتا رہے لیکن اہل مذاق اور ارباب ذوق ونظر ہمیشہ ان کے مقابلے میں مومن کا کلام پسند کرتے رہیں گے"[1]

کہا جاتا ہے کہ مومن کے یہاں تضاد ہے صرف شاعری ہی میں نہیں اُن کی زندگی بھی مجموعۂ اضداد ہے دراصل مزاجاً مومن حق پرست واقع ہوئے تھے لڑکپن سے زندگی کے ایک خاص حصے تک وہ عشق کرتے رہے حسن وعشق کی رنگ رلیوں، بدمستیوں اور جوانی کی بہاروں سے لُطف اندوز ہوتے رہے لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مذہبی ماحول اور اس کے گردوپیش کے حالات سے بھی غافل نہ تھے جس کا اثر اُن کی زندگی پر تھا جس نے بعد میں اُن کو تائب کرکے بالکل بدل دیا اس کا واضح عکس اُن کی شاعری میں موجود ہے اسے تضاد کہنا یوں درست نہیں کہ مومن سے قطع نظر دُنیا میں کہاں تضاد نہیں، کون زندگی کے تضادات کے مختلف پہلوؤں کی زد سے محفوظ ہے مومن کا تو تخلص بھی اُن کی طبیعت اور اُن کے درمیان ایک تضاد بلکہ حسن تضاد بن کر اُبھرتا ہے جس کی مثالیں اُن کے مقطعوں میں بیشتر جگہ موجود ہیں۔

کیوں سُنے عرض مضطر اے مومن صنم آخر خدا نہیں ہوتا

شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا تو نے مومن بتوں کو کیا جانا

مومن چلا گیا تو چلا جائے اے بتو آخر قدیم خادم بیت الصنم نہ تھا

مومن اور دَیر خدا خیر کرے طور بے ڈھب نظر آتے ہیں مجھے

---

[1] ادب کا مقصد ص ۹۷

ہائے صنم ہائے صنم لب پہ کیوں　　　خیر ہے مومن تمھیں کیا ہوگیا

مومن کے کلام میں یادوں کے تسلسل سے متعلق اشعار بھی کچھ اس انداز سے ملتے ہیں جو اُن کی یادگار حیاتِ عشق کے پر کیف لمحوں کی یاد دلاتے ہیں۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو　　　وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو، وغیرہ

یادوں کے تسلسل کا یہ انداز جو اس زمین کے سارے اشعار یا واسوخت نما غزل میں موجود ہے اور جس کا رشتہ حسرت تک قائم ہے اس کا سہرا مومن کے سر ہے۔

زبان کی سادگی، محاورات و روزمرہ کا استعمال، رمزی علائم و تشبیہات، صنائع بدائع اور دیگر تکلفاتِ شعری بھی مومن کی غزلوں میں موجود ہیں یہاں طوالت کے خوف سے ان کی مثالیں نہیں پیش کی جا رہیں لیکن مومن غزل کے نئے آہنگ کا شاعر کے عنوان کے پیشِ نظر اُن کی غزلوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بات اُن کے محاسنِ شعری کے سلسلے میں جو بطورِ خاص کہی جاسکتی ہے وہ اُن کی اہم شاعرانہ خصوصیت فکرِ شاعرانہ ہے جس سے اُن کی ندرتِ ادا، اچھوتے اندازِ بیان اور چونکا دینے والے طرزِ خاص کا پتہ چلتا ہے کہا جاتا ہے کہ نگار کے مومن نمبر کی اشاعت (۱۹۲۸) کے موقعہ پر نیاز فتح پوری نے مومن کی اس خصوصیت کا ذکر کیا تھا لیکن پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کے بیان کے مطابق پروفیسر ضیا احمد بدایونی نے اس خصوصیت کا ذکر سب سے پہلے اپنے ایک مضمون میں (اُردو ادب) کیا تھا ضیا صاحب مرحوم نے مومن کے محقق و نقاد کی حیثیت سے دیوانِ مومن اور قصائدِ مومن پر جو قابلِ قدر کام انجام دیا ہے اور ان کی کلامِ مومن اور بالخصوص غزلیاتِ مومن پر بھی جو نظر تھی اُسی کی روشنی میں کوئی وجہ نہیں کہ اس بیان کی حقیقت سے انکار کیا جائے۔ اگرچہ یہ وصف شاعری تازہ گوئی کے ذیل میں آتا ہے لیکن چونکہ مومن کے یہاں یہ خصوصیت ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس کا ذکر یہاں خاص طور پر ضروری ہے۔

اس وصف شاعری کے ذیل میں مومن نے بیشتر جگہ کچھ ایسا طرز اختیار کیا ہے جس میں اپنے فائدے کی بات معشوق سے کچھ اس پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ اس میں اُس کی خیر خواہی دکھائی دے اور بظاہر مومن کا اپنا کوئی فائدہ یا مقصد نظر نہ آئے اس طرح معشوق شاعر کے مکر کا شکار ہو جاتا ہے غزل کا وہ روایتی شاعر جو عام طور پر معشوق کے فتنہ و شر کا شکار رہتا ہے اور ہمیشہ اس کے رحم و کرم

پر رہ کر بندگی بے چارگی کی سراپا تصویر بنا ہوتا ہے وہ مومن کے تکبر شاعرانہ والے اشعار میں کچھ اور دکھائی دیتا ہے اُن کی اردو فارسی شاعری میں اس خصوصیت کے نمونے بیشتر غزلوں میں ملتے ہیں اردو غزل میں مومن کی یہ پہلی آواز ہے جو عاشق کا سر فخر سے اونچا کرتی ہے اس سے انکار نہیں کہ بعض دوسرے شعراء نے بھی یہ طرز اپنے یہاں اختیار کیا لیکن مومن کے یہاں یہ معراج کمال پر ہے مثال کے طور پر ملاحظہ ہو

مومن کے معشوق کے پاس دشمن کا خط آیا ہے وہ مومن کو جلانے کے لیے اسے اپنی سرمگیں آنکھوں سے لگاتا ہے مومن نے اسے ناقابلِ برداشت سمجھ کر معشوق کو مشورہ دیا کہ اپنی سرمے سے بھری آنکھوں سے یہ خط نہ لگاؤ سرمہ خاک ہی تو ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ خط پہ لکھا ہوا دشمن کا نام خاک میں مل جائے یہ سنتے ہی معشوق نے خط آنکھوں سے ہٹالیا شعر ملاحظہ ہو

سرمگیں آنکھوں سے نامے کو لگاتے کیوں ہو   خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

معشوق مومن کی طرف دیکھنے میں جھجکتا ہے لیکن اسے دشمن کی طرف دیکھنے میں کوئی شرم نہیں، مومن کہتے ہیں کہ اگر تم کو میرے دشمن (رقیب) سے دوستی ہے تو دیکھو اس کی طرف نہ دیکھنا چونکہ تمہاری نگاہ جادو بھری ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پر سحر ہو جائے شعر ہے :

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا   جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

ایک شعر میں یہ رُخ بھی ملاحظہ ہو :

محبوب بے التفاتی برتتا ہے مومن کو اس کا شدت سے احساس ہے ہو سکتا ہے لوگ اسے طعنے بھی دیتے ہوں اُن سے بچنے کے لیے کہتا ہے کہ اس کا مجھے نہ دیکھنا اُس کی مہربانی کی نظر ہی تصور کیجیے کیونکہ اُس نے اگر دیکھ لیا تو سکون و قرار وہ سب برباد ہو جائے گا ۔ شعر سنیے :

پامال اک نظر میں ثبات و قرار ہے   اُس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

معشوق کی محفل میں رقیبوں کے ساتھ مومن بھی موجود ہے مومن کی معشوق سے التجا ہے کہ دیکھو محفل میں سب پر نظر ڈال کر مجھ پہ بھی ایک سرسری نظر ڈال لینا اگر ایسا نہ کرو گے اور سب کو دیکھتے رہو گے اور صرف مجھ پہ ہی نظر نہ ڈالو گے تو لوگ تمہارے اور میرے درمیان کوئی خصوصی تعلق سمجھ لیں گے اور راز کھل جائے گا ۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا　　مری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

مومن نے ایک جگہ اور ہنر شاعرانہ کی ایک عمدہ مثال پیش کی ہے جو تازہ گوئی کا بھی ایک اعلیٰ نمونہ ہے فرماتے ہیں کہ دل کے شعلے کو اپنی چمک دمک پر بڑا غرور ہو گیا ہے یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مدمقابل کوئی ہے ہی نہیں ذرا اسے اگر اپنا جلوہ تو دکھا دو تاکہ اس کی ساری روشنی ماند پڑ جائے اور اپنی حقیقت کا پتہ چل جائے مقصد اس سے یہ ہے کہ وہ پردہ نشیں جو جلوہ دکھانے سے عار کرتا ہے اس طرح مومن کے سامنے بے پردہ آجائے اور مومن اس کا دیدار کر لے ۔

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے　　اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

ہنر شاعرانہ کے اس حسن شعری کی اور بھی مثالیں مومن کے یہاں موجود ہیں تشریح سے قطع نظر نمونے کے طور پر ہم ان اشعار ہی پہ اکتفا کریں گے :

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا　　مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

درباں کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجے قتل　　ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں　　انکار ہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ　　تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ　　بدنامی عشاق کا اعزاز تو دیکھو

لذتِ جور کشی نے مجھے شرمندہ کیا　　طعنے کیا کیا اُسے ارباب ستم دیتے ہیں

وہ بدخواہ مجھ سا تو میرا نہیں　　عبث دوستی تم کو دشمن سے ہے

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

رحم کر خصم جانِ غیر نہ ہو　　سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

اس مختصر سے مطالعہ میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ مومن اپنے عہد میں اور اپنے معاصرین کی موجودگی میں اپنے جس رنگ و آہنگ سے پہچانے جاتے ہیں وہ ندرتِ خیال، جدتِ ادا اور مخصوص طرزِ بیان کے علاوہ جملہ روایتی محاسنِ شعری پر جو خصوصیت نمایاں ہے وہ اُن کی تازہ گوئی اور مکر شاعرانہ کا حُسن ہے جس کو لب لباب کے طور پر ہم رنگِ تغزل میں ایک منفرد آواز اور تازہ و نئے آہنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مومن کے معاصرین میں غالبؔ کی عظمت ہمارے پیشِ نظر نہیں غالبؔ کی عظمت اُن کے فلسفے، اندازِ بیان، مضمون آفرینی اور دیگر لائقِ تحسین خوبیوں کی بنا پر اپنی جگہ مسلم لیکن مومنؔ کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے غالبؔ جیسی قدآور شخصیت کی موجودگی میں اپنی انا کے ساتھ مرتبۂ شاعری کو برقرار رکھا اور اپنی طرزِ ادا کے آپ موجد ہوئے اپنی شاعری کو زندہ رکھا اُس میں بالیدگی پیدا کی اور اپنی غزلوں کے اس تازہ و نئے آہنگ کے ذریعہ خود بھی زندہ رہے یہ مومنؔ کی اپنی منفرد آواز تھی جس نے اُسے حیاتِ دوام کی بشارت دی غالب کی تسلیم شدہ عظمت سے قطع نظر مومنؔ کے محاسنِ شعری کی روشنی میں اُن کے یہاں ایک مخصوص طرزِ ادا ملتا ہے جسے نئے آہنگ کا نام دیا جا سکتا ہے اگر اُن کی شاعری کو مستقبل میں اور کھنگالا گیا تو شاید اس سے آگے کی اور منزلیں روشن ہو سکیں جو مومن اور مطالعۂ مومنؔ کے دیگر نئے گوشوں کو اُجاگر کر سکیں آخر میں ہم مومنؔ کی غزل کے نئے آہنگ کی نشان دہی کے طور پر چند درجہ ذیل اشعار پیش کرنا مناسب سمجھیں گے۔

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی　　ناصح یہ بند غم نہیں، قیدِ حیات ہے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے　　ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی　　زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے　　کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں　　لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے　　ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ڈاکٹر صلاح الدین

مومن اور شیفتہ

مومن اور شیفتہ پر گفتگو کرنے سے پیشتر کچھ نکات ایسے ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے۔ غالب کے معاصرین میں مومن کا کیا مقام ہے اس پہ یہاں کافی گفتگو کی جا چکی ہے۔ لیکن مومن کے حوالے سے شیفتہ کا تذکرہ میرے مقالے کا اصل موضوع ہے۔۔۔۔ شیفتہ ہمارے ادب کے دورِ متوسطین کا وہ نام ہے جسے مومن سے ہی نہیں غالب کے حوالے سے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بقول نیاز فتحپوری :

شیفتہ اپنے زمانے کا اچھا شاعر تھا اور یہ ممکن نہیں کہ مومن اور غالب کے ذکر کے ساتھ اُس کو نظر انداز کر دیا جائے :

لیکن چونکہ مجھے اپنے مقالے میں مومن کے حوالے ہی سے شیفتہ پر گفتگو کرنی ہے لہٰذا غالب کا ذکر بطور حوالہ ہی پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

نواب مصطفیٰ خاں جو اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے ۱۸۰۶ء مطابق ۱۲۱۸ ہجری میں دہلی شاہجہاں آباد بازار چتلی قبر کے نزدیک اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے کی مروجہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے، خوش فکری، خوش عصری اور خوش عمری کے ردِ عمل میں شعر گوئی اور عشق جوئی سے دوچار ہوئے۔ خود اُن کے بیان کے مطابق شاعری کا آغاز انیس سال

کی عمر میں ہوا اور "زر ربت وسیوم" میں "بالِ اعراض کرامت کردند" کا امتیاز حاصل کر لیا ایک اور شعر میں بھی وہ یہی دعوا کرتے ہیں ؎

اے شیفتہ اس فن میں ہوں اک پیر طریقت
گو عمر ہے میری ابھی اکیس برس کی

محاذِ شاعری کے علاوہ انھوں نے عشق کے محاذ پر بھی پیر طریقت کا درجہ اسی عمر میں حاصل کر لیا اور رحمو نام کی طوائف (جو شیفتہ کی محبت میں شاعرہ ہو گئی تھی اور نزاکت تخلص اختیار کیا تھا) کے ساتھ رشتہ محبت استوار کر کے عشق مجازی کا میدان بھی سر کر لیا۔
(ثبوت کے لیے گلشن بے خار اور مخطوطہ دیوانِ شیفتہ و دیگر معاصرین کے تذکرے ملاحظہ ہوں)
آج تک جو شواہد دستیاب ہیں اُن کی روشنی میں اشوک کی جنگ کی طرح شیفتہ کا یہ عشق پہلا بھی تھا اور آخری بھی۔ اس کی مدت لگ بھگ دس سال پہنچتی ہے۔

اس کے بعد شیفتہ کی زندگی کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے وہ ۱۸۳۹ء مطابق ۱۲۵۴ ہجری میں حجِ بیت اللہ کے لیے تشریف لے جاتے ہیں اور واپس آنے کے بعد شعر گوئی اور عشق جوئی دونوں سے تائب ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد اُن کے یہاں جو تبدیلی رونما ہوتی ہے وہ خود ان کی زبانی ملاحظہ ہو۔
"مرا بایں تربات چہ کار، طائر سدرہ نشیں را بر چوب تخیل آشیاں مبند چوں ربط بایں فن از دیگر اشغالِ عالیہ و فنونِ شریفہ بازمی دارد مگر بتحریکِ محفلاں گاہے از وارداتِ جدیدہ اتفاق می افتد"

اے شیفتہ ہم جب سے کہ آئے ہیں حرم سے
شوقِ صنم و خواہش صہبا نہیں رکھتے

اس بیان کی روشنی میں شیفتہ کی شاعرانہ شخصیت کی کُل مدت تقریباً تیرہ چودہ سال ہوتی ہے اس کے بعد تو وہ بس گاہے گاہے بتحریکِ محفلاں کی ترغیب کے زیرِ اثر ہی کچھ کہہ لیا کرتے تھے، جس کی حیثیت تبرک سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا شیفتہ کی یہی وہ تیرہ چودہ سال کی شاعری ہے جس میں رنگ بھی ہیں اور رلیاں بھی ہیں محبوب بھی ہے اور اس کے کوچے گلیاں بھی ہیں شعر بھی

ہے۔ شباب بھی ہے اور رباب بھی ہے اُس کے بعد تو بس فکرِ ثواب ہے۔ حساب نماز ہے او خوف عذاب ہے۔

شیفتہ کی شاعرانہ زندگی کا یہی وہ سنہری دور ہے جسے دورِ شیفتگی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اِس کے بعد تو شیفتہ گم ہو جاتے ہیں اور نواب مصطفیٰ خاں باقی رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا میری گفتگو کی بنیاد شیفتہ کے اسی شاعرانہ دور پر مبنی ہے۔

جہاں تک شیفتہ کے سلسلۂ تلمّذ کا تعلق ہے، جب تک مومن زندہ رہے شیفتہ کے اُستاد رہے لیکن مومن کے انتقال کے بعد انھوں نے غالب سے مشورۂ سخن کے نام پر رشتۂ تلمّذ جیسی کوئی چیز ضرور استوار کر لی تھی جس کا سلسلہ غالب کی وفات ۱۸۶۹ء تک اُستوار رہا اور غالب کے انتقال کے چند ماہ بعد اُسی سال خود شیفتہ کا انتقال بھی ہو گیا۔

حجِ بیت اللہ سے واپسی کے بعد شیفتہ کے مزاج پر مذہب غالب آ چکا تھا جس کا اثر سب سے زیادہ اُن کی شاعری پر ہوا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے اُردو دیوان کی اشاعت ۱۸۳۲ء مطابق ۱۲۴۸ ہجری کے وقت ایسا سارا کلام انتخاب سے خارج کر دیا جو اِس دورِ شباب کی بے اعتدالیوں کی پردہ دری کرتا تھا۔ کچھ اشعار میں انھوں نے بدلے ہوئے مزاج کے مطابق تبدیلیاں بھی کر دیں اِس طرح اُن کی زندگی کے وہ گوشے جو اُن کی شاعری کا بنیادی محرک تھے عرصہ دراز تک پردۂ خفا ہی میں رہے۔ ۱۹۵۴ء میں کلبِ علی خاں فائق رام پوری نے پہلی بار یہ سارا غیر مطبوعہ کلام شائع کیا۔

حالاں کہ مومن نے اپنے شاگرد رشید کو اس سے باز رہنے کے لیے شاعرانہ زبان میں کوئی مشورہ بھی دیا ہوگا جس کی غمازی شیفتہ کے اس شعر سے ہو رہی ہے: ؎

شیفتہ حضرتِ مومن کا ہے فتویٰ، بس اب
حسرتِ حرمتِ صہبا و مزامیر نہ کھینچ

لیکن شیفتہ نے نہ صرف یہ کہ اُستاد کے مشورے پر عمل نہیں کیا بلکہ اِس شعر کو بھی قابلِ اشاعت نہ سمجھ کے اِس کے قالب کو بلحاظ تقویٰ یوں تبدیل کر دیا۔ آپ بھی سُن لیجیے اور وجد کیجیے: ؎

وجد کو زمزمۂ مرغِ سحر کافی ہے
شیفتہ نازِ مغنّی و مزامیر نہ کھینچ

جہاں تک شیفتہ کی ادبی اور شاعرانہ حیثیت کی بات ہے اُس پر کچھ کہنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے چند ہمعصروں کی رائے کو مختصراً پیش کر دیا جائے۔ اِس سلسلہ میں سب سے پہلے اُن کے اُستاد اُن کے یارِ غار اُن کے مونس و ہمدم مومن کی رائے پیش ہے۔ وہ دیوان شیفتہ کی تقریظ میں لکھتے ہیں :

"سخن سنجان را نوید کہ شیفتۂ معنی نواز، دادِ سخن شناسی دادہ و سخن شناسانِ نکتہ دانی را جاں بلب رسیدہ"

اور یہ کہتے کہتے وہ یہاں تک پہنچتے ہیں کہ :

عمرِ دوبارہ دریاب/عیسٰی نفس/معجز نماست

گلشنِ بے خار کی تقریظ میں مومن شیفتہ کے لیے فرماتے ہیں :

ندیدم چنیں شاعرے بکتہ سنج
کہ ریزد ز کلکش گہر گنج گنج

بدِقت اگر مو شگافی کند
زموے میاں شعر بافی کند

زِ تحسینِ او حسنِ معنی نیاز
ہزار آفریں بر چنیں امتیاز

اپنی ایک مثنوی میں مومن نے آٹھ شاگردوں کے تخلص درج کیے ہیں اور اُن میں شیفتہ کے ضمن میں لکھا ہے :

شیفتہ سرِ دفترِ اہلِ قلم
نکتۂ خاطر نشاں جس کا رقم

بے عدیل و بے سہیم و بے بدل
بے نظیر و بے مثال و بے مثل

راز دانِ نکتہ ہاے کس مداں
معنی کرسی نشیں خاطر نشاں

ہم نفس، ہم دم، رضاجو، دوستدار
شیفتہ دِلدار والا جاں نثار

غالب کہتے ہیں:

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

مفتی صدر الدین ان کو بلند فطرت کہتے ہیں اور اُن کے یہاں سُرعتِ فکر، دقتِ نظر، طبعِ مشکل پسند، فکرِ دقیق، اندیشۂ باریک، تازگیِ معانی، اور طراوتِ الفاظ کی نشاندہی کرتے ہیں۔
سرسید انھیں نبض شناسِ سخن فہمی و سخن دانی کہتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اگر رنگینی مضامین کے گُل کو رنگ، اور عبارت کی لطافت کو آب نہ دے تو بلبل کا عشق کامل اور تاجِ سلاطین کی زیب تمام نہ ہو۔
یہ شیفتہ کے متعلق ان ہمعصروں کی آرا ہیں جن کی عظمت و احترام میں کوئی شک و شبہ نہیں۔
دراصل شیفتہ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اُس میں علم و ادب اور شعر و شاعری کا چرچا گھر گھر ہو چکا تھا، مشاہیرِ ادب سے دِلّی بھری پڑی تھی۔ روز مشاعرے ہوتے، علم و ادب کی محفلیں منعقد ہوا کرتیں، میر نظام الدین ممنوںؔ، حافظ عبد الرحمٰن احسانؔ اور ان دونوں سے زیادہ شاہ نصیر دِلّی کے ادبی حلقوں میں اپنی اُستادی کا لوہا منوا رہے تھے۔ اُدھر لکھنؤ میں ناسخ کی شاعری اور شاعرانہ اسلوب کے ڈنکے پٹ رہے تھے۔ اور ان سب حضرات کا اثر اُس عہد کے نوجوان شعرا پر بھی مرتب ہو رہا تھا جس میں ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ بھی شامل ہیں۔ اُردو غزل کا عہدِ شباب تھا۔ نئے اسلوب کے ساتھ نئے خیالات اور نئے معنی کی فکر عام تھی۔ شاہ نصیر اور شیخ ناسخ کے اسلوب سے سب ہی متاثر تھے۔
ایسے مشاہیر کی مجالس اور ایسے ماحول میں شیفتہ کا ذوقِ شعری پروان چڑھا اور یہ

سب آوازیں بیک وقت اُن کے کانوں میں پڑیں۔ یوں تو طبیعت کی مناسبت کے باعث شیفتہ، مومن کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوئے لیکن اُن کے کلام کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی ان سبھی آوازوں سے متاثر ہوئے۔ موضوعاتِ شاعری اور نفسِ مضمون کے معاملے میں وہ دہلوی شاعری کے قریب ہیں مگر اسلوبِ ادا، طرزِ فکر اور زبان و بیان کے نقطۂ نظر سے وہ لکھنوی شاعری اور اُس میں بھی ناسخ کے اسلوب کے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔

اصل میں ہوا یوں کہ شیفتہ کے دور تک آتے آتے نئی اور پرانی قدروں کا ٹکراؤ واضح طور پر نظر آنے لگا تھا۔ ایک طرف روایت بھی عزیز تھی تو دوسری طرف بغاوت بھی مرغوب تھی۔ اِس کا اثر اس عہد کے زبان اور ادب پر بھی پڑا اُردو شاعری اور نثر دونوں اس سے متاثر ہوئیں نتیجہ یہ ہوا کہ اُس دور کا شاعر اور ادیب ذہنی طور سے غیر شعوری سطح پر تذبذب کا شکار ہو گیا اِس ذہنی کشمکش نے کبھی اُس کو روایت کی طرف جھکایا تو کبھی روایت سے بغاوت کی طرف دوڑایا۔ ناسخ کا اُسلوب شاعری غالب کے خطوط اور ماسٹر رام چندر کی نثر سب ہی اس ذہنی کشمکش کا ردِعمل ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ اُس دور میں دہلی کی شاعری روایت بغاوت کے مابین جھولا جھولتی رہی اور ایک ہی وقت میں دونوں آوازیں سنائی دینے لگیں۔

اگرچہ وہ مراتب سخن میں ایک ادائے خاص رکھتے ہیں لیکن اُن کی طبیعت ہر روشِ سخن گوئی سے کچھ ایسی مناسبت رکھتی ہے کہ وہ ہر انداز سے شعر کہہ سکتے ہیں۔

شیفتہ کی انفرادیت اس میں نہیں ہے کہ انھوں نے اپنا کوئی منفرد رنگ یا ممتاز اُسلوب پیدا کیا بلکہ اُن کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اُردو شاعری کی ان تمام آوازوں کو اپنی شاعری میں سمونے کی کامیاب کوشش کی جو اُن سے قبل یا اُن کے عہد کی شاعرانہ مجلسوں میں مقبولِ عام تھیں۔ اس لیے شیفتہ کی شاعری کو ایک ایسے آئینہ خانے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس میں انیسویں صدی کے تمام استادانِ فن کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں اس حقیقت کی تصدیق خود شیفتہ کے اِس قول سے بھی ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

در مراتب سخن اگرچہ ادائے خاص دارد اما طبع با ہر روش

چناں مناسب افتادہ کہ بہر شیوہ سخن می گنم۔

اس کے علاوہ اُن کا منتخب دیوان بھی شاہد ہے کہ اُنھوں نے بیشتر غزلیں اپنے پیش رو اور ہمعصر اساتذہ کے دواوین کو سامنے رکھ کر کہی ہیں جن میں میر، سودا، درد، مصحفی، آتش، ذوق، غالب اور بالخصوص ناسخ اور مومن بہت اہم ہیں۔

دوسرے اساتذہ کے رنگ میں شعرگوئی کی یہ کوشش اتنے وسیع پیمانے پر اُردو شاعری میں مصحفی، شیفتہ اور حسرت موہانی کے یہاں نمایاں ہے۔

ان تمام رنگوں کے موتیوں کو ایک لڑی میں پرونے سے شیفتہ کو جہاں یہ فائدہ ہوا کہ اُن کے کلام میں متنوع جاذبیت پیدا ہوگئی اور وہ اپنے عہد کی شاعرانہ مجلسوں میں مقبول ہوگئے وہیں یہ نقصان بھی ہوا کہ اُن کی شاعرانہ شخصیت اِن اُستادانِ فن کے مقابلے میں ماند پڑ گئی اور آج اُن کے صرف ایسے اشعار پڑھنے کے لائق رہ گئے جن میں بیان کی ہمہ گیری، اُسلوب کا تنوع اور فکر و خیال کی گہرائی اور گیرائی موجود ہے۔ یوں تو شاعری کے متعلق شیفتہ کا نظریہ یہ تھا:

وہ طرزِ فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفتہ
معنی شگفتہ۔ لفظ خوش انداز صاف ہو

لیکن ان کی شاعری کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ شیفتہ 'لفظ خوش' میں کچھ زیادہ ہی اٹک گئے اور معنی شگفتہ اور انداز صاف سے کُلی طور پر نہیں بڑی حد تک دور ہو گئے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ شیفتہ کا وہ عہد کہ جب وہ زندگی اور شاعری دونوں کی خرافات سے تائب ہو کر زندگی کے ایک اندازِ فکر کو اپنا چکے تھے اُس وقت اُنھوں نے اِس مسلک کو اپنایا ہوگا۔ میں اپنے اِس مفروضے کی تائید میں حالی کا یہ قول بھی پیش کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

"درحقیقت مرزا کے شورے و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور

پیچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا۔ اسی کو منتہائے کلام سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ ومحاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ متنفر تھے۔"

یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شیفتہ کے کلام میں ایک حصہ تو وہ ہے جس پر ناسخیت کا رنگ چھایا ہوا ہے دوسرا وہ جو رنگینیِ بیان کے زمرے میں آتا ہے جسے ہم مومنیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ موضوعات کے نقطۂ نظر سے البتہ اُن کے کلام میں دہلویت کا رنگ نمایاں ہوا ہے مگر طرزِ بیان اور اسلوب ادا میں لکھنویت یا ناسخیت زیادہ غالب ہے اور ایسا ہونا قدرتی بھی تھا اس لیے کہ اس عہد میں ناسخ کے اسلوب کو معیارِ شاعری بلکہ معراجِ شاعری تصور کیا جانے لگا تھا۔ خود شیفتہ کے استاد مومن اور غالب دونوں اس اسلوب کے پرستار نظر آتے ہیں اس لیے کہ یہ دھارا اس قدر قوی تھا کہ اس سے بچا نہیں جا سکتا تھا۔ دوسرے شیفتہ کی بڑھی ہوئی علمیت کو بھی اس کا ایک سبب کہا جا سکتا ہے۔

مومن کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے نور الحسن ہاشمی لکھتے ہیں:

"کلام مومن کی شعریت میں اُن کے تعقیدی طرز کے علاوہ ایک دو باتیں اور بھی حائل ہوتی ہیں یعنی اُن کی علمیت اور مذہبیت۔"

میرا خیال ہے کہ یہ رائے مومن کے شاگردِ رشید پر بھی صادق آتی ہے کیونکہ وہ عربی و فارسی کے عالم تھے اور مومن کے شاگرد بھی یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں اکثر عربی اور فارسی کے بہت سے نامانوس اور ثقیل الفاظ کا بے دھڑک استعمال ہوا ہے۔ جیسے

اسفلِ جحیم، لطفِ عمیم، دیوِ رجیم، عظامِ رمیم، مزاجِ سقیم، اخترِ بختِ نشزند موسمِ ریاحین، معنبر کی طیب، رجلوہ گہہ لا تشف وشف، انفاسِ باد ناشۂ بعد الوقوع، زد زباد، بیمِ عقوبت، وجہ کفاف، لمعانِ آفتاب بنت العنب، پلید اور طرید وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کے بیسوں الفاظ ایسے ہیں جن کی وجہ سے غزل کی شعریت شدید مجروح ہوئی ہے اور شیفتہ مومن کے بجائے ناسخ کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔ وہی تمثیلی پیرایۂ بیان

شعر کے باطنی حسن سے زیادہ خارجی حسن پر زور دہی پُر تکلف انداز بیان۔ کہنے کو تو انھوں نے یہ بھی کہا تھا: کبھی دل میں ہوا ئے شیوہ ہا ے میر پھرتی ہے۔ مگر اس شیوہ ہا ے میر کا معاملہ اُن کے یہاں کبھی کبھی اور کہیں کہیں ہی جلوہ گر ہوتا ہے۔

حالی لکھتے ہیں:

"لوگ اُن کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار مانتے تھے اُن کے سکوت سے شاعر کا شعر خود اُس کی نظر سے گر جاتا تھا اور اُن کی تحسین سے اُس کی قدر بڑھ جاتی تھی۔"

لیکن شعر کو جانچنا اور پرکھنا الگ فن ہے اور شعر کہنا الگ بات ہے یوں بھی یہ سب خوبیاں کسی کو اعلیٰ درجے کا شاعر بنانے کی ضامن نہیں کیونکہ بقول خواجہ احمد فاروقی:

"نگار سخن اپنے سنگھار کے لیے شاعر کے خون دماغ سے زیادہ خونِ دل کی خراج چاہتی ہے اور اقبال کے لفظوں میں خونِ دل کے بغیر ہر نقش ناتمام اور ہر نغمہ سودائے خام ہے۔"

جہاں تک شیفتہ کے کلام میں رنگِ مومن کا تعلق ہے تو دونوں کے کلام کا موازنہ کرنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ اُن غزلوں میں بھی جو شیفتہ نے مومن کی غزلوں کو سامنے رکھ کر کہیں ہیں مومن کے رنگ کو نہیں اپنایا یوں کہہ لیجیے کہ اپنانے کی کوشش کے باوجود بھی نہیں اپنایا جا سکا یہ الگ بات ہے کہ غزل کے ایک دو شعروں میں یا پچیس تیس غزلوں میں رنگِ مومن کی شبیہہ نظر آجاتی ہے وہ بھی قطعی نہیں بلکہ کبھی اسلوبِ ادا میں کبھی نفسِ مضمون میں، کبھی شوخیِ اداییں کبھی معاملہ بندی میں اور کہیں کہیں رنگینی بیان اور وارداتِ عشق کے بیان میں۔

حضرات، شیفتہ کے دیوان میں غزلوں کی کُل تعداد ۱۷۲ ہے اور مومن کے دیوان میں بقول عبادت بریلوی ۲۱۸ ہے یعنی شیفتہ سے ۴۶ غزلیں زیادہ ہیں۔

میں نے شیفتہ کے دیوان کا مومن کے دیوان سے ردیف وار موازنہ اور شمار کیا تو پتا چلا کہ دونوں کے یہاں ۷۵ غزلیں ایسی ہیں جو باعتبار ردیف ایک جیسی ہیں ان سب غزلوں سے میں نے ایک ایک دو شعر نقل کیے ہیں تاکہ شیفتہ کے کلام میں رنگِ مومن

کا پتا چلایا جا سکے یہی نہیں بلکہ ہم قافیہ اشعار تک کو موازنہ کر کے دیکھا تب بھی شیفتہ مومن سے کم اور ناسخ کے زیادہ قریب نظر آئے۔ اس کے بعد بیں نے اسلوبِ ادا اور طرزِ بیان کو مومن سے ملانے کی سعیِ جمیل کی تو وہ بھی سعیِ لاحاصل ثابت ہوئی۔

رہیں یہاں بات مستثنیات کی نہیں کر رہا بلکہ میری مراد کلام شیفتہ کے بڑے حصّے سے ہے، اب اگر کوئی یہ پوچھے کہ پھر کلام شیفتہ کا وہ کون سا حصّہ ہے جو انھیں اپنے اُستاد مومن خاں سے قریب کرتا ہے تو اس سلسلے بیں یہ عرض کروں گا یہ حصّہ اُن چیدہ چیدہ اشعار کا ہے جنھیں بیں مستثنیات سے تعبیر کر رہا ہوں۔ اگر اسے کھینچ تان کے بڑھا بھی دیا جائے تب بھی یہ تعداد کل اشعار کی تعداد کا ایک چوتھائی حصہ ہی بیٹھے گی اب اِس ایک چوتھائی حصے کو کسی شاعر کا مخصوص رنگ محض اس لیے قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ فلاں اسکول یا فُلانے اُستاد سے وابستہ رہا ہے بلکہ یہاں بیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہر شاعر کا اپنا مخصوص مزاج۔ اُفتادِ طبع اور اخذ و استفادہ کا غیر شعوری سطح پر وہ عمل جاری رہتا ہے جو شعوری سطح کے مقابلے بیں زیادہ قوی اور اَہم ہوتا ہے —— ورنہ کیا وجہ ہے کہ شیفتہ معنی شگفتہ، لفظ خوش اور انداز صاف ہونے کے شعوری نظریے کے باوجود اُس پر عمل پیرا نہ ہو سکے۔ ہُوا بھی نہیں جا سکتا تھا اس لیے آورد کے ہجوم بیں آمد کے عمل دخل کی گنجائش بہت کم باقی رہ جاتی ہے۔ اُس پر علمیت اور مذہبیت کا غلبہ اور ناسخیت کا ہلّہ جو زبان و بیان کے معیار کی عصری کسوٹی بن کر قبولِ خاطرِ خاص و عام ہو چکا تھا۔

پھر مومن کے کلام بیں پائی جانے والی شوخیِ ادا کے لیے مومن جیسی رنگینیِ طبع بھی ضروری تھی اور جنسیت کے لیے مومن جیسی حسیت بھی ضروری تھی علاوہ ازیں مومن نے چھے عشق کیے اور ڈٹے رہے۔ شیفتہ نے ایک ہی عشق کیا اور جیبں بول گئے۔ حج کو گئے۔ توبہ تِلّا کی اور یوں کفارہ ادا کیا کہ اپنے بہت اشعار کو بلحاظ تقویٰ بدل ڈالا یا نہیں بدلا تو قلم زد کر کے قابلِ اشاعت نہ سمجھا، مثلاً نسخہ مخطوطہ مملوکہ رضا لائبریری میں ایک شعر ہے:

تقویٰ شعار بیں ہوں نہ عصمت سرشت تم
پھر مجھ سے کونسا ہے سبب احتراز کا

اب تقویٰ شعار ہونے کے بعد اس کا کیا حشر ہوا آپ بھی ملاحظہ فرمایئے :

تقویٰ مرا شعار ہے، عصمت سرشت دوست
پھر مجھ سے کونسا ہے سبب احتراز کا

ایک مثال اور پیش ہے۔ نسخۂ مخطوطہ میں ایک شعر اس طرح درج ہے :

شوق اُس کا بڑھ گیا، حوروں کا جلوہ دیکھ کر
یاد آئے عیشِ دنیا، رنجِ عقبیٰ دیکھ کر

اب ذرا نسخۂ مطبوعہ کی تبدیلی کا جلوہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے :

شوقِ خوباں اڑ گیا، حوروں کا جلوہ دیکھ کر
رنجِ دنیا مٹ گیا آرامِ عقبیٰ دیکھ کر

تو صاحب یہ تھا صرف ایک عشق کا کفارہ۔ اگر کہیں اپنے استاد مومن کی طرح شیفتہ نے بھی پانچ چھے عشق کر لیے ہوتے تو قیاس یہ کہتا ہے ہمیں شیفتہ کا کلام ہی نہیں ملتا اور اگر ملتا تو وعظ و پند کی صورت میں شاعری کی کتاب ہوتی۔ کیا رنگِ مومن اور کیا مومن کا اثر۔ شیفتہ اور اُن کی شاعری پر بحث کرتے وقت یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جیسے انشا اللہ خاں انشاؔ کی ذہانت و فطانت کو نواب سعادت علی خاں کی صحبت کھا گئی تھی اسی طرح شیفتہ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو اُن پر مذہبی غلبے نے ہضم کر لیا۔ وہ خود بھی فرماتے ہیں :

یہ بات تو غلط ہے کہ دیوانِ شیفتہ
ہے نسخۂ معارف و مجموعۂ کمال
لیکن مبالغہ تو ہے البتہ اس میں کم
ہاں ذکرِ خدّ و خال اگر ہے تو خال خال

اس ساری بحث سے میرا مدعا یہ ہے کہ شیفتہ نے چونکہ شاعری کو اشغالِ عالیہ میں شمار کرنا چھوڑ دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اتنی تعداد میں بلند پایہ اشعار نہ کہہ سکے جیسا اُن جیسی صلاحیت رکھنے والے شاعر سے توقع کی جاسکتی تھی۔

غزل ایک اندرونی دلی کیفیت کا بے باکانہ اظہار ہوتا ہے۔ اس میں اس کی گنجائش ہی نہیں ہوتی کہ کونسی بات مذہبی اعتبار سے مذموم ہے اور کونسی بات عقبیٰ کو سنوار سکتی ہے شعر کا یہ مدوجزر بیانیہ انداز اس کی اثر و تاثیر کو گرا دیتا ہے۔ اسی شعر کو بلند تر اور خوب تر کہا جا سکتا ہے جس کے اندر تجربے کی شدت، متضاد جذبوں کا تصادم جذباتی بلندی و پستی کا اظہار، داخلی لگن اور اضطراب و کرب ہو۔ جہاں شاعر اپنی داخلی کیفیات کے اظہار میں ہچکچانے لگتا ہے اور اپنے تجربات کے اظہار سے اجتناب کرنے لگتا ہے کہ کہیں اس کی ظاہری شخصیت کو ٹھیس نہ پہنچے تو ایسے موقع پر تخلیقی عمل پھیکا اور افسردہ ہو کر بے جان ہو جاتا ہے۔

شیفتہ کی شاعری کو بھی اُن کی شخصیت کے اِس ظاہری روپ نے بہت نقصان پہنچایا اور شاعرانہ اعتبار سے اپنے وقت کی بہت بڑی قوت ہونے کے باوجود وہ غالب یا مومن کے ہم پلہ نہ بن سکے، حالانکہ دیوانِ شیفتہ میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے بڑے نادر اور اچھوتے ہیں لیکن جذبے کی کمی اور شعر کی ظاہری قبا پر توجہ دینے کے باعث اِس میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے یہی شیفتہ کی اُردو شاعری کا المیہ ہے اور اِسی وجہ سے ہمارے ادب کے عام ناقدین نے انھیں شاعر کی حیثیت سے کم ایک ناقد، اور ایک سخن فہم اور سخن شناس کی حیثیت سے زیادہ قبول کیا ہے۔

تاریخ ادبِ اُردو میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں :

> "شیفتہ بہ نسبت شاعر کے ناقد کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں اپنے زمانے میں بھی اُن کو یہی شہرت حاصل تھی۔ ساتھ ہی نواب صاحب کی سخن فہمی کی اتنی شہرت تھی کہ غالب جیسا باکمال اپنے اشعار کی اچھائی اور برائی کی کسوٹی نواب صاحب کی پسندیدگی کو قرار دیتا ہے۔"

حکیم سیّد عبدالحی مولف "گلِ رعنا" لکھتے ہیں :

> "اُس زمانے میں نواب صاحب کی سخن گوئی سے زیادہ اُن کی سخن فہمی کی دھوم تھی مرزا نوشہ تک اُن کی سخن فہمی کے معترف و مداح تھے۔"

مولانا صلاح الدین دیوانِ شیفتہ کے مقدمے میں لکھتے ہیں :

"یہ سچ ہے کہ وہ (شیفتہ) خود کوئی بہت بڑا سخن ور نہ تھا لیکن اردو شاعری کے زریں دور نے بھی اُس جیسا سخن فہم پیدا نہیں کیا"

برخلاف اِس کے جب کبھی ایسا ہوا ہے کہ جذبے اور خیال نے اصل حالت میں اُن کے اشعار میں گھل مِل کر ایک وحدت اور اکائی کی شکل اختیار کی ہے تو اُن کی شاعری کا قد مومن کی شاعری کی طرح بلند ہو گیا ہے اور کلامِ شیفتہ کا یہی وہ حصہ ہے جسے رنگِ مومن کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسے اشعار کی تعداد مومن کے مقابلے میں شیفتہ کے یہاں بہت کم ہے جسے مومن کا طفیل، مومن کا رنگ، مومن کا فیض یا کچھ اور نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ صرف چند مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

شاید اِسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ہم طالبِ شہرت ہیں، ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا

آتی نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں، پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لیے

یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھُل
صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

کیا جانے گزری غیر پہ کیا اُس کی بزم میں
آئے وہ اس طرح سے مجھے پیار آگیا

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

ایسی رغبت سے کرے قتل، گماں کا ہے کو تھا
شیفتہ اُس کو تو لو تم سے محبت نکلی

پروانہ وار جلنا دستور ہے ہمارا
اُس شمع رو پہ مرنا مشہور ہے ہمارا

تھی لحظہ لحظہ ہجر میں اِک مرگِ نو نصیب
ہر دم خیالِ لب سے ترے ہم جیا کیے

یاں خار و خس کو بے ادبی سے نہ دیکھنا
یاں عالمِ شہود ہے آئینہ ذات کا

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں
گُل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

شیشہ اُتار، شکوے کو بالائے طاق رکھ
کیا اعتبار زندگی بے ثبات کا

تری شمیم نے گلزار کو کیا برباد
تری نگاہ نے کھوئی دکان بادہ فروش

گھبرا کے اور غیر کے پہلو سے لگ گئے
دیکھا اثر یہ نالۂ بے اختیار کا

وہ شیفتہ کہ دھوم ہے حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

انتخابِ کلامِ مومنؔ

[اُردو]

:..... نیازؔ فتحپوری
(نگار، مومنؔ نمبر)

غزلیات

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے — نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا
عنایت کر مجھے آشوب گاہِ حشرِ غم اک دل — کہ جس کا ہر نفس ہم نغمہ ہو شورِ قیامت کا

●

اُس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی — کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا
اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل — میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

بُت خانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے
مومنؔ بس اب معاف! کہ یاں جی بہل گیا

●

نہ جاؤں گا کبھی جنت میں، میں نہ جاؤں گا — اگر نہ ہووے گا نقشہ تمھارے گھر کا سا
یہ جوشِ یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت — دُعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا

●

گر وہاں بھی یہ خموشی اثر افغاں ہوگا — حشر میں کون مرے حال کا پُرساں ہوگا
اُن سے بدخو کا کرم بھی ستمِ جاں ہوگا — میں تو میں غیر بھی دل دے کے پشیماں ہوگا

خواہشِ مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اَور بھی ارماں ہوگا

●

آخر اُمید ہی سے چارہ' حرماں ہوگا — مرگ کی آس پہ جینا شبِ ہجراں ہوگا

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری — چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا
کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل — تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا
کیونکے امیدِ وفا سے ہو تسلی دل کو — فکر ہے یہ کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا

دوستی اس صنمِ آفتِ ایماں سے کرے
مومن ایسا بھی کوئی دشمنِ ایماں ہوگا

•

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا — دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے — آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا
غیر عیادت سے بُرا مانتے — قتل کیا آن کے اچھا کیا
زندگیِ ہجر بھی اک موت تھی — مرگ نے کیا کارِ مسیحا کیا
جور کا شکوہ نہ کروں ظلم ہے — راز مرا صبر نے افشا کیا
رحم فلک اور مرے حال پر — تو نے کرم اے ستم آرا کیا
سچ ہی سہی آپ کا پیماں ولے — مرگ نے کب وعدۂ فردا کیا

دشمنِ مومن ہی رہے بت سدا
مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

•

موئے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا — بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا
خدا کی یاد دلاتے تھے نزع میں احباب — ہزار شکر کہ اس دم وہ بدگماں نہ ہوا
ہنسے نہ غیر مجھے بزم سے اٹھانے پر — سبک ہے وہ کہ تری طبع پر گراں نہ ہوا
وہ آئے بہرِ عیادت تو تھا میں شادیِ مرگ — کسی سے چارۂ بیدادِ آسماں نہ ہوا
لگی نہیں ہے یہ چپ لذتِ ستم سے کہ میں — حریفِ کشمکشِ نالہ و فغاں نہ ہوا

امیدِ وعدۂ دیدارِ حشر پر مومن
تو بے مزہ تھا کہ حسرت کشِ بتاں نہ ہوا

سب تا بہ فتنہ چونک پڑے تیرے عہد میں ۔۔۔ اک میرا بخت تھا کہ وہ بیدار کم ہوا
کچھ قیس اور میں ہی نہیں سب کے سب تو ہے ۔۔۔ اچھا تو دردِ عشق کا بیمار کم ہوا
ذکرِ بتاں سے پہلی سی نفرت نہیں رہی
کچھ اب تو کفرِ مومنِ دیندار کم ہوا

•

میں وہم سے مرتا ہوں وہاں رعب سے اس کے ۔۔۔ قاصد کی زباں سے نہیں پیغام نکلتا
حوریں نہیں مومن کے نصیبوں میں جو ہوتیں ۔۔۔ بت خلنے ہی سے کیوں یہ بد انجام نکلتا

•

وصل کی شب شام سے میں سو گیا ۔۔۔ جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا
آئنہ جلدی سے پٹک دو کہیں ۔۔۔ دل ہی نہیں ہاتھ سے دیکھو گیا
صبر نہیں شام فراق آچکو ۔۔۔ جس سے کہ بیزار تھے تم سو گیا
ہائے صنم ہائے صنم لب پہ کیوں
خیر ہے مومن تمھیں کیا ہو گیا

•

ڈر تو مجھے کس کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا ۔۔۔ پر حال یہ افشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
مت پوچھ یہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم ۔۔۔ بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اے چارہ گرو قابلِ درماں نہیں یہ درد ۔۔۔ ورنہ مجھے سودا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
ہر وقت ہے دشنام، ہر اک بات میں طعنہ ۔۔۔ پھر اس پہ بھی کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو ۔۔۔ سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
مومن بخدا سحر بیانی کا جبھی تک
ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

•

تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری ۔۔۔ تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

غم مرا کس لیے کہ دنیا میں ـ نہ رہا میں مرا فسانہ رہا
مدعا غیر سے کہتا تا وہ
سمجھے اب کچھ بھی مدعا نہ رہا

•

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے ـ جی بلا سے رہا رہا نہ رہا
تو، فلک، مرگ، ہم سے سب غافل ـ اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا

•

بسکہ اک پردہ نشیں سے دلِ بیمار لگا ـ جو مریضوں سے چھپاتے ہیں وہ آزار لگا
کعبے سے جانبِ بت خانہ پھر آیا مومن ـ کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

•

شب غمِ فرقت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا ـ دم رکے تھا سینے میں کمبخت جی گھبرائے تھا
یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا ـ تھے غلط پیغام سارے کون یاں تک آئے تھا
بات شب کو اس سے منعِ بیقراری پر بڑھی ـ ہم تو سمجھے اور کچھ، وہ اور کچھ سمجھائے تھا
ناز و شوخی دیکھنا وقتِ تظلم دمبدم ـ مجھ سے وہ عذرِ جفا کرتا تھا اور جھنجھلائے تھا

— — — — — — — — — — — — — — — — —

ہو گئی دو روز کی الفت میں کیا حالت ابھی
مومنِ وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

•

عبث الفت بڑھی تم کو وہ کب دیتا تھا دم تم پر ـ یہ مجھ کو دیکھ کر دشمن کلیجا تھام لیتا تھا
سحر تک شام سے تجھ بن یہی حالت رہی دل نے ـ نہ مجھ کو چین دیتا تھا نہ آپ آرام لیتا تھا
نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا ـ کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا
اگر مومن ہی ہو مومن وہ لے میں تو نہ مانوں گا
جو عہدِ دوستی وہ دشمنِ اسلام لیتا تھا

میرے کوچے میں عدو مضطر و ناشاد رہا　　شب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا
نقدِ جاں تھا نہ سزائے دیتِ عاشق حیف　　خون فرہاد سرِ گردن فرہاد رہا
بیکسی نے نہ دیا ہائے تہِ خاک بھی چین　　تا قیامت الم گریۂ جلاد رہا
لذتِ جور سے دم لینے کی فرصت نہ رہی　　کیا اثر منتظرِ دعوتِ فریاد رہا
یاد سہواً اسے اے غیرتِ نسیاں عمداً　　یاد رکھ بھول گیا جس کو وہی یاد رہا
کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

•

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا　　میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا
روز کہتا تھا کہیں مرتا نہیں، ہم مر گئے　　اب تو خوش ہو بے وفا تیرا ہی لے کہنا کیا
دلبروں میں بے وفا میری وفا کی دھوم ہے　　بوالہوس سے کیوں کہا تھا راز جو افشا کیا
کیا خجل ہوں اب علاجِ بیقراری کیا کروں　　دھر دیا ہاتھ اس نے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا
عرضِ ایماں سے خدا اس نازِ کفرِ دیں کو بڑھی
تجھ سے اے مومن خدا سمجھے یہ تو نے کیا کیا

•

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا　　نہ ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا
کیا تم نے قتلِ جہاں اک نظر میں　　کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا
دمِ الحذر اور عشقِ بتاں سے
تجھے ڈر ہے اے مومن ایسا کسی کا

•

دل کو تعلق ہے ترکِ محبت کے بعد بھی　　اب آسماں کو شیوۂ بیداد آ گیا

•

وعدۂ وصلت سے دل ہو شاد کیا　　تم سے دشمن کی مبارک باد کیا

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
ہیں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر — ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا
نشۂ الفت سے بھولے یار کو — سچ ہے ایسی بیخودی میں یاد کیا
جب مجھے رنجِ دل آزاری نہ ہو — بے وفا پھر حاصلِ بیداد کیا
کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر — ولولہ کیا، نالہ کیا، فریاد کیا
ان نصیبوں پر کیا اخترشناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا
گر بہائے خونِ عاشق ہے وصال — انتقامِ زحمتِ جلاد کیا

بتکدہ جنت ہے چلیے بے ہراس
لب پہ مومن ہرچہ بادا باد کیا

٭

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا — میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
خدنگِ یار کے ہمراہ نکلی جان سینے سے — یہی ارمان اک مدت سے جی میں تھا نکل آیا

٭

روزِ جزا جو قاتلِ دلجو خطاب تھا — میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا
پھرنے سے شامِ وعدہ تھکے یک کہ سو رہے — آرام شکوۂ ستمِ اضطراب تھا
کیا کیا شکن دیے ہیں دلِ زار کو مگر — اس کے خیال میں ورقِ انتخاب تھا
عاشق ہوئے ہیں آپ کہیں گو اسی پہ ہیں — شب حالِ غیر مجھ سے زیادہ خراب تھا
وقتِ وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے — یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا
ہوں کیوں نہ محوِ حیرتِ نیرنگہائے عشق — جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں آب تھا

کیا جی لگا ہے تذکرۂ یار میں عبث
ناصح سے مجھ کو آج تلک اجتناب تھا

٭

مجھ کو تیرے عتاب نے مارا　　یا مرے اضطراب نے مارا
کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں　　مجھے فکرِ جواب نے مارا

•

زانوے بت پہ جان دی دیکھا　　مومن انجام و اختتام مرا

بندگی کام آ رہی آخر　　میں نہ کہتا تھا کیوں سلام مرا

•

نازِ بیجا سے سوا شرم کے حاصل نہ ہوا　　غیر پر ظلم کیے میرے مقابل نہ ہوا
کیا گلے ہوتے گر اوروں پہ بھی رحم آجاتا　　شکر صد شکر کہ میرا سا ترا دل نہ ہوا
خوں چھپانے کو مری لاش سے کہتا ہے وہ شوخ
مجھ کو یہ غم ہے کہ میں کیوں ترا قاتل نہ ہوا

•

جوابِ خونِ ناحق میرا ایسا کیا دیا تو نے　　کہ ظالم رہ گئے منہ لے کے سب احباب اپنا سا

•

کیا مرتے دم کے لطف میں پنہاں ستم نہ تھا　　وہ دیکھتے تھے سانس کو اور مجھ میں دم نہ تھا

درباں کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجیے قتل　　ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

•

صبح سے تعریف ہے صبر و سکونِ غیر کی　　کس نے شب مجھ کو تڑپتے پیشِ درد کھلا دیا
موت کے صدقے کہ وہ بے پردہ آئے لاش پر　　جو نہ دیکھا تھا تماشا عمر بھر دکھلا دیا

•

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا　　میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
اڑتے ہی رنگِ رخ مرا نظروں سے تھا نہاں　　اس مرغِ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں   اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا
دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب   تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا
میری نگاہِ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو
بے طاقتی پہ سرزنشِ ناز دیکھنا

•

پندگو حالِ زلیخا یاد کر کچھ خیر ہے   کام دل جس کو ملا یاں بعدِ رسوائی ملا
کہہ رہا ہے کون کس سے بے شکیبائی ملا   مجھ کو قسمت سے نصیحت گر بھی سودائی ملا

•

جوں نکہتِ گل جنبش ہے جی کا نکل جانا   اے بادِ صبا میری کروٹ تو بدل جانا
دم لینے کی طاقت ہے بیمارِ محبت ہے   اتنا بھی غنیمت ہے مومن کا سنبھل جانا

•

محوِ جفا ستم کشِ الطاف کب ہوا   رحم اس کو میرے حال پہ آیا غضب ہوا
کس دن تھی اس کے دل میں محبت جواب نہیں   سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا
بجلی گری فغاں سے مری آسمان پر   جو حادثہ کبھی نہ ہوا تھا سو اب ہوا
ربطِ بتانِ دشمنِ دیں اتہام ہے
ایسا گناہ حضرتِ مومن سے کب ہوا

•

دھو دیا اشکِ ندامت نے گناہوں کو مرے   تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہو گیا
ہو گیا سن کر نویدِ وصل شادی مرگ میں   لب تلک یہ زمزمہ آیا کہ شیون ہو گیا
مومنِ دیندار نے کی بت پرستی اختیار
ایک شیخِ وقت تھا سو بھی برہمن ہو گیا

•

تھے دشت میں ہمراہ مرے آبلۂ چند   سو آپ ہی پامال کیا قافلہ اپنا

انصاف کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر ہم　　تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

•

رازِ نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہنچا　　کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچا
اللہ ری ناتوانی جب شدت قلق میں　　بالیں سے سر اٹھایا دیوار تک نہ پہنچا
روتے تو رحم آتا سو اس کے روبرو تو　　اک قطرۂ خوں بھی چشم خونبار تک نہ پہنچا

مفت ادلِ سخن میں عاشق نے جان دیدی
قاصد ترا بیاں کیوں اقرار تک نہ پہنچا

•

یہ کسی سے ہو کہ ان لطفوں پہ گستاخی نہ ہو　　غیر ہم ساکب ہوا ہر چند ہم سا ہو گیا

•

کیا رشکِ غیر تھا کہ تحمل نہ ہو سکا　　میں جان کر حریفِ تغافل نہ ہو سکا
ہجرِ بتاں میں تجھ کو ہے مومن تلاشِ زہر　　غم پر حرام خوار توکل نہ ہو سکا

•

شوخ کہتا ہے بے حیا جانا　　دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا
شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے　　اپنا جلوہ زرا دکھا جانا
اس کے اٹھتے ہی ہم جہاں سے اٹھے　　کیا قیامت ہے دل کا آجانا
پوچھنا حالِ یار ہے منظور　　میں نے ناصح کا مُدّعا جانا

شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا
تو نے مومن بتوں کو کیا جانا

•

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آگیا　　ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا
کچھ آنکھ بند ہوتے ہی آنکھیں سی کھل گئیں　　جی اک بلائے جان تھا اچھا ہوا گیا
آنکھیں جو ڈھونڈھتی تھیں نگہ ہائے التفات　　گم ہونا دل کا دہ مری نظروں سے پا گیا

وہ ہنسے سن کے نالہ بلبل کا — مجھے رونا ہے خندۂ گل کا
دھیان ہے غیر کے تحمل کا — ہوش دیکھا ترے تغافل کا

•

، افزائے رخ کے لیے مے نوش ہوا — میں کبھی آپ میں آیا تو وہ بے ہوش ہوا
ںِ دل میں رہی خنجرِ دشمن کے سبب — اپنے قاتل سے خفا تھا کہ میں خاموش ہوا

تونے جو قہرِ خدا یاد دلایا مومن
شکوۂ جورِ بتاں دل سے فراموش ہوا

•

ں آہ کو جو میں نے کہا، مسکرا دیا — دل گرمیوں نے اس کی کلیجا جلا دیا
اتے ہیں وصال ہے انجامِ کارِ عشق — کیا ناصحِ شفیق نے مژدہ سنا دیا

•

ریِ امید سے فرصت ہے رات دن — وہ کاروبارِ حسرت و حرماں نہیں رہا
تے ہیں اپنے زخمِ جگر کو رفو ہم آپ — کچھ بھی خیالِ جنبشِ مژگاں نہیں رہا

ناکامیوں کا گاہ گلہ گاہ شکر ہے
شوقِ وصال و اندوہِ ہجراں نہیں رہا

•

یا رم نہ کروگے اگر ابرام نہ ہوگا — الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا
مِی امید پہ صبر آئے تو کیا آئے — ہر بات میں کہتے ہو کہ یہ کام نہ ہوگا
ہوگئی ہجراں میں تڑپنے کی شبِ وصل — گو چین ہو ان کو مجھے آرام نہ ہوگا

وہ مشق رہی اور نہ وہ شوق ہے مومن
کیا شعر کہیں گے اگر الہام نہ ہوگا

•

آپ کی کونسی بڑھی عزت — میں اگر بزم میں ذلیل ہوا

بے وفا کہنے کی شکایت ہے تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
حالِ دل یار کو لکھوں کیونکر ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرضِ مضطرب مومنؔ
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

●

کیا ہوا، ہوا گر وہ بعدِ امتحاں اپنا بے گنہ سزا پائے اب وہ دل کہاں اپنا
خار و خس میں گلشن کے بوئے گل جو آتی تھی رشک سے کیا برباد آپ آشیاں اپنا
روز کا بگاڑ آخر جان پر بنا دے گا ان کو شوقِ آرائش دل ہے بدگماں اپنا
بعد مدت اس کو سے یوں پھرے تبنگ آ کر جاے جاے پھرتے ہیں پوچھتے مکاں اپنا
دشنہ چھین لے گا کیا ہمنشیں شبِ فرقت آپ جب نہیں اپنے کون میری جاں اپنا
صبر بعدِ آسائش اس تعلق پہ مشکل تھا عیشِ جاوداں نکلا رنجِ جاوداں اپنا
عشقِ بت میں خود اب تو درخورِ پرستش ہیں نام ہو گیا اتنا گم کیا نشاں اپنا
دل کی بے قراری سے ہر طپش زمیں فرسا بہرِ خرمنِ گردوں شعلہ ہر فغاں اپنا
دیکھئے پسِ مردن حالِ جسم و جاں کیا ہو مدعی زمین اپنی دشمن آسماں اپنا

دیر و کعبہ یکساں ہے عاشقوں کو اے مومنؔ
ہو رہے وہیں کے ہم جی لگا جہاں اپنا

●

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا
ایک ایک ادا سو سو دیتی ہے جواب اسکے کیونکر لبِ قاصد سے پیغام ادا ہوتا

اس بخت پہ کوشش سے تھکنے کے سوا حاصل — گر چارۂ غم کرتا رنج اور سوا ہوتا
دیوانے کے ہاتھ آیا کب بندِ قبا اس کا — ناخن جو نہ بڑھ جاتے تو عقدہ یہ وا ہوتا

ہم بندگیِ بت سے ہوتے نہ کبھی کافر
ہر جا اگر اے مومنؔ موجود خدا ہوتا

●

عدم میں رہتے تو شاد رہتے اسے بھی فکرِ ستم نہ ہوتا — جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا
پڑا ہے مرنا بس اب تو ہم کو جو اس نے خط پڑھ کے نامہ بر سے — کہا کہ گر ہیچ یہ حال ہوتا تو دفتر اتنا رقم نہ ہوتا
جو آپ در سے اٹھا نہ دیتے کہیں نہ کرتا میں جبہ سائی — اگرچہ یہ سرنوشت میں تھا تمہارے سر کی قسم نہ ہوتا

ہوا مسلماں میں اور ڈر سے نہ درسِ واعظ کو سن کے مومنؔ
بنی تھی دوزخ بلا سے بنتی عذابِ ہجرِ صنم نہ ہوتا

●

اُس زود گسل سے خود بگڑتے — گر عمر کا اعتبار ہوتا

●

ویراں ہے خانہ جلوۂ حیرت طراز کا — آئینہ دیکھتا ہے منہ آئینہ ساز کا
تھے ہمیں مومنؔ کی خود داری پہ کیا کیا اعتماد — کیا خبر تھی یہ کہ یوں محوِ بتاں ہو جائے گا

●

قتل عدو میں عذرِ نزاکت گراں ہے اب — مجھ میں تم اٹھانے کی طاقت کہاں ہے اب
کہہ دیں رقیب نے تری بے التفاتیاں — ناصح ہمارے حال پہ کچھ مہرباں ہے اب

چشم غضب سے مشورۂ قتل کھل گیا
جو بات دل میں تھی سو نظر سے عیاں ہے اب

●

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب — غیر اور تم بھلے بھلا صاحب
کیوں الجھتے ہو جنبشِ لب سے — خیر ہے میں نے کیا کہا صاحب

ستم آزار، ظلم و جور و جفا جو کیا سو بھلا کیا صاحب
کس سے بگڑے تھے کس پہ غصہ تھا رات تم کس پہ تھے خفا صاحب
کس کو دیتے تھے گالیاں لاکھوں کس کا شب ذکرِ خیر تھا صاحب
نامِ عشقِ بتاں نہ لو مومن
کیجیے بس خدا خدا صاحب

•

سودا تھا بلا کا جوش پر رات بستر پہ بچھائے نیشتر رات
تارے آنکھیں جھپک رہے تھے تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

•

حورانِ بہشتی کو بتوں کا سا نہ پایا مومن مجھے کیونکر نہ ہو ایماں کی شکایت

•

اظہارِ شوق شکوہ اثر اس سے تھا عبث یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا عبث
میں ایک سخت جان ہوں گردوں سے پوچھ لو تم کو خیال ہے مرے آزار کا عبث
امیدِ وعدہ بھی تو نہیں روزِ ہجر میں ہم سے وفا سے زندگیِ بے وفا عبث
اس ضعف میں تو سینے سے آتا ہے لب تلک کہتے ہیں اپنے نالے کو ہم نارسا عبث
اے روزِ حشر کچھ شبِ ہجراں بھی کم نہیں بدنام ہو جہان میں تیری بلا عبث
ہرگز نہ رام وہ صنمِ سنگدل ہوا
مومن ہزار حیف کہ ایماں گیا عبث

•

خو رنجِ رشکِ غیر کی بھی ہم کو ہو گئی اب اور کچھ نکالیے آزار کی طرح
دل میں ہوائے بتکدہ ظاہر میں کیا حصول رہنا حرم میں مومنِ مکار کی طرح

•

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح
مر چک کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے کہتے تو ہیں بھلے کی ولیکن بری طرح

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں　　کمبخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح
پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے　　آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح
نے جلئے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے　　کیا کیجیے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح
ہوں جاں بلب بتانِ ستمگر کے ہاتھ سے
کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومنؔ اسی طرح

•

ہم دامِ محبت سے ادھر چھوٹے ادھر بند　　پرواز بھی کی آہ تو جوں طائرِ پر بند
یہ مشتِ پرِ سوختہ پھونکیں گے قفس کو　　تو ساتھ کسی کے مجھے صیاد نہ کر بند
کیا حضرتِ مومنؔ کہیں کعبے کو سدھارے
سنسان ہے در کس لیے کیوں آج ہے در بند

•

غربت میں گل کھلائے ہے کیا کیا وطن کی یاد　　جیسے قفس میں مرغِ چمن کو چمن کی یاد
تا شکوہ غیر کا نہ کروں مجھ سے کہتے ہیں　　کیوں سرگذشت تم کو بھی ہے کوہکن کی یاد
ایسے ہی روز گر ستمِ نو بہ نو رہے
تم کو بھلا رہے گی سپہرِ کہن کی یاد

•

نہ کیونکر بس مو ا جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر　　وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر
نوید اے دل کہ رشکِ غیر سے چھوٹے اسے ہم نے　　ستم کا کر دیا خوگر جفا و جور سہہ سہہ کر
لگی ہچکی ہے سر زانوئے غم پر ہے کہ یاد آیا　　کسی کا ہاتھ ہر دم مارنا زانو پہ تہہ تہہ کر
خدا کو مان اپنی راہ لے کعبے کو جا مومنؔ
صنم خانے میں کیا کھوئے گا اے گم گشتہ رہ رہ کر

•

جراح کیا سوچا بتا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا　　کیوں کھول لی پٹی مرے زخمِ جگر سے باندھ کر

شوق وصال دیکھ کہ آیا عدو کے گھر سوجھا نہ کچھ مجھے شبِ مہتاب دیکھ کر
تو یہ کہاں کدورتِ باطن کا ہوش تھا غش ہوگیا میں رنگِ مئے ناب دیکھ کر
ہے ہے تمیزِ عشق و ہوس آج تک نہیں وہ چھپتے پھرتے ہیں مجھے بے تاب دیکھ کر
مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ہو
کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھ کر

•

امتیازِ دلدہی و دلبری میں فرق ہے تم کو بھاتی ہے خزاں اور ہم کو بھاتی ہے بہار

•

دشمنی دیکھو کہ تا الفت نہ آجائے کہیں لے لیا منہ پر دوپٹا حال میرا دیکھ کر

•

سب ستم ہائے نہاں نظروں میں تھے ناصح نہ پوچھ کیا کہوں میں غش ہوا کیا سوچ کر کیا دیکھ کر
جو نقاب اٹھی مری آنکھوں پہ پردہ پڑگیا کچھ نہ سوجھا عالم اس پردہ نشیں کا دیکھ کر
کر دیا خاک آپ کو اس بت کے در پر ہائے ہائے
جل گیا جی لاش کو مومن کی جلتا دیکھ کر

•

عاشق تو جانتے ہیں وہ اے دل یہی سہی ہر چند بے اثر ہے یہ آہ و فغاں نہ چھوڑ
زخمی کیا عدو کو تو مرنا محال ہے قربان جاؤں تیرے مجھے نیم جاں نہ چھوڑ
جس کوچے میں گزار صبا کا نہ ہوسکے
اے عندلیب اس کے لیے گلستاں نہ چھوڑ

•

ہجراں کا شکوہ لب تلک آیا نہیں ہنوز لطفِ وصال غیر نے پایا نہیں ہنوز
باغِ جہاں میں گو مہِ خرداد آگیا یاں ہے اسی بہار پہ فصلِ خزاں ہنوز
ناصح رقیب سے ہے بد آموز تر کہیں پر میں نے تیرا حال سنایا نہیں ہنوز

یک چند اور کاہشِ غمِ چشمِ التفات ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ہیں یار کی نظر میں سمایا نہیں ہنوز
مومن تو مدتوں سے ہوئے پر بقول درد
دل سے نہیں گیا ہے خیالِ بتاں ہنوز

•

چاکِ سراپردہ سے جھانکے تھے وہ ایک دن ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سجدۂ محرابِ در شغلِ جبیں ہے ہنوز
لے کے دل و عقل و دیں پھر پئے غارتِ عشق ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اے اجل آپک کہیں جانِ حزیں ہے ہنوز
وصلِ بتاں کی دعا کرتے ہو شکرِ خدا
حضرتِ مومن تمہیں دعویِ دیں ہے ہنوز

•

ڈوبا جو کوئی آہ کنارے پہ آگیا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ طغیانِ بحرِ عشق ہے ساحل کے آس پاس
کیا دعوی آہ جب نہ رہا میں ہی کس لیے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ہیں جمع اقربا مرے قاتل کے آس پاس
کافر ہے کون ہم میں سے مومن پھرے ہے تو
کعبے کے آس پاس تو میں دل کے آس پاس

•

میرے مرنے سے بھی وہ خوش نہ ہوا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ جی گیا یوں ہی رائگاں، افسوس
شکوہ آزارِ غیر کا جو کروں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ہنس کے کہتا ہے وہ کہ ہاں افسوس
تھا عجب کوئی آدمی مومن
مر گیا کیا ہی نوجواں، افسوس

•

خبر لو مری تم کہاں تک رہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ یہ حالت کہ غش پر چلا آئے غش

•

ہر غنچہ لب سے عشق کا اظہار ہے غلط ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اس بحثِ صحیح کی تکرار ہے غلط
کرتے ہیں مجھ سے دعویِ الفت وہ کیا کریں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کیوں کر کہیں مقولۂ اغیار ہے غلط

کرتے ہو مجھ سے راز کی باتیں تم اس طرح
گویا کہ قولِ محرمِ اسرار ہے غلط

•

آتا ہے بے کسوں پہ تو جلاد کو بھی رحم　　روتی ہے شمع آپ سرِ کشتگانِ شمع
ہے تارِ گریہ تارِ نفس اہلِ سوز کو　　یعنی روانِ شمع ہے اشکِ روانِ شمع
سب گرمی نفس کی ہیں اعضا گدازیاں　　دیکھو نہ زندگی ہے سراپا زیانِ شمع
لائیں نہ تابِ حرفِ بتاں کافرانِ عشق
پروانے کو جحیم ہے مومن زبانِ شمع

•

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف　　دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف
شامِ فراق خوابِ عدم کا ہے انتظار　　آنکھیں لگی ہیں دولتِ بیدار کی طرف

•

شبِ ہجر روزِ وصال کی تری شوخیاں جو نظر میں تھیں　　کہوں کیا تغیرِ حالِ دل کبھی تھا سکوں کبھی تھا قلق
کہا جاں بلب ہوں جو آئے تو مری زندگی ہو تو یوں کہا　　ترے جینے کی مجھے کیا خوشی ترے مرنے کا مجھے کیا قلق

•

قہر ہے موت ہے قضا ہے عشق　　سچ تو یوں ہے بُری بلا ہے عشق
وصل میں احتمالِ شادی مرگ　　چارہ گر دردِ بے دوا ہے عشق
اثرِ غم ذرا بتا دینا　　وہ بہت پوچھتے ہیں کیا ہے عشق
آپ مجھ سے نباہیں گے سچ ہے　　با وفا حسن و بیوفا ہے عشق
سوجھے کیوں کر فریبِ دلداری　　دشمنِ آشنا نما ہے عشق
قیس و فرہاد و وامق و مومن
مر گئے سب ہی کیا وبا ہے عشق

•

امتحاں کے لیے جفا کب تک التفاتِ ستم نما کب تک
غیر ہے بے وفا پہ تم تو کہو ہے ارادہ نباہ کا کب تک
جرم معلوم ہے زلیخا کا طعنۂ دستِ نارسا کب تک
ہوش میں آ کہ مجھ میں جان نہیں غفلتِ جرأت آزما کب تک
اے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

●

وفورِ اشک و طغیانِ فغاں ہے کدھر جاؤں ادھر پانی اُدھر آگ
دھواں اٹھتا ہے دل سے وقتِ گریہ بجھا دی تو نے کیا اے چشمِ تر آگ

●

داغِ جنون و سنگِ درِ یار ہو نصیب کرتا ہے رات دن ہوسِ تاج و تختِ دل
الماس ریزہ تھے مرے آنسو کہ ضبط سے ہے پاش پاش سب جگر اور لختِ لختِ دل

●

مردِ عشق ستیزہ کار ہے دل ملک الموت سے دوچار ہے دل
وصلِ جاناں کہاں سوائے خیال ہم ہیں مایوس امیدوار ہے دل
بے دوا درد و بے وفا ہے وہ شوخ
بے اثر آہ و بے قرار ہے دل

●

کیا کروں کیونکر رکوں ناصح رکا جاتا ہے دل پیش کیا چلتی ہے اس سے جس پر آجاتا ہے دل
حیرتِ دیدار بس آئینہ رکھ دے ہاتھ سے اپنی حالت دیکھ کر ظالم کٹا جاتا ہے دل
چاہتا ہوں میں تو مسجد میں رہوں مومن ولے
کیا کروں بت خانے کی جانب کھنچا جاتا ہے دل

●

لو چھوڑ مجھے چلا گیا دل ہے اس سے زیادہ بے وفا دل
یہ دشمنِ جاں تمھیں مبارک یعنی نہیں میرے کام کا دل
دیتا ہوں دم ایسے فتنہ گر پر انصاف سے دیکھنا مرا دل
اس چشم نے کر دیا خراب آہ
تھا ورنہ بہت ہی پارسا دل

•

شب رہے تجھ بِن زبس بے چین و بے آرام ہم صبح تک رویا کیے لے لے کے تیرا نام ہم
گر ترے کوچے کو دی کعبے سے نسبت کیا گناہ مومنؔ آخر تھے کبھی اے دشمنِ اسلام ہم

•

پاتے تھے چین کب غمِ دوری سے گھر میں ہم راحت وطن کی یاد کریں کیا سفر میں ہم
اس طرح خاک چھانتے پھرتے نہ دشت دشت ہوتے جو پائمال کسی رہ گذر میں ہم

•

اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ تو ایک ایک کے منہ کو تکا نہ کرتے ہم

•

نہیں پاتے اثر اپنا یہ غیرت کا اثر دیکھا کہا کرتے تھے بے تابی کو بے تاثیر اکثر ہم
ہوئے تم کیوں خفا تاثیر سے آہِ رسا کی اب کیا کرتے تھے یہ تو پہلے بھی تقصیر اکثر ہم

•

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم
صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم
کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

•

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم — تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم
اگر نہ ہنسنا ہنسانا کسی کا بھا جاتا — تو بات بات پہ یوں رو دیا نہ کرتے ہم

●

ثابت ہے جرم شکوہ نہ ظاہر گناہِ رشک — حیراں ہیں آپ اپنی پشیمانیوں میں ہم
مارے خوشی کے مر گئے صبحِ شبِ فراق — کتنے سبک ہوئے ہیں گراں جانیوں میں ہم
پیشِ نظر ہے کس کا رخ آتش گداز
روتے ہیں اپنے حال پہ حیرانیوں میں ہم

●

خنجر تو نہ توڑ سخت جانی — پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم
تو، بخت، عدو، اجل، فلک، دل — کس کس کے ستم اٹھائیں گے ہم
ٹھہرو کوئی دم کہ جان ٹھہرے — مت جاؤ کہ جی سے جائیں گے ہم
بت خانۂ چیں ہو جو ترا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

●

شام سے اپنے سو رہے وہ تو اور ہم ان کے کوچہ میں — ولولہ ہائے شوق سے کیا کیا پھرتے ہیں گھبراتے ہیں
کیا کسی بت کے دل میں جگہ کی کوئی ٹھکانا اور ملا — حضرت مومن اب تمہیں کچھ ہم مسجد میں کم پاتے ہیں

●

عشق نے یہ کیا خراب ہمیں — کہ ہے اپنے سے اجتناب ہمیں
غیر کے واسطے نہ ہو بے تاب — طعنہ دیتا ہے اضطراب ہمیں
کس کی زلفوں کی بو نسیم میں تھی — ہے بلا آج پیچ و تاب ہمیں
وہ جفا کش ہیں اے فلک کہ کیا — اس ستم گر نے انتخاب ہمیں
اب کوئی کیا کرے علاج افسوس — موت نے بھی دیا جواب ہمیں
اے تپ ہجر دیکھ مومن ہیں — ہے حرام آگ کا عذاب ہمیں

لذتِ جورکشی نے مجھے شرمندہ کیا   طعنے کیا کیا اسے اربابِ ستم دیتے ہیں
دم نہ لے لے اثرِ آہ کہ معلوم ہوا   جن پہ دم دیتے ہیں ہم وہ ہمیں دم دیتے ہیں

اہلِ بازارِ محبت کا بھی کیا سودا ہے
عشرتِ عمرِ ابد قیمتِ غم دیتے ہیں

•

ناصحِ ناداں یہ دانائی نہیں   دل کو سمجھاؤں میں سودائی نہیں
کس توقع پر امیدِ وصل اب   طاقتِ صبر و شکیبائی نہیں

•

کہے ہے چھیڑنے کو میرے گر سب ہوں مرے بس میں   نہ دوں ملنے کسی معشوق اور عاشق کو آپس میں
نہ میں اپنا نہ دل اپنا نہ تم میرے نہ جاں میری   اثر کس کس کو ہو ہوئے بھی گر فریادِ بیکس میں

دربت خانۂ عشقِ بتاں اور آپ اے مومن
یہ حضرت آگئی اک بار کیا طبعِ مقدس میں

•

دم بدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں   یا کہیں عاشق ہوئے یا ہوگیا سودا ہمیں
ہر ستم صیاد کا کیا التفات آمیز تھا   بند کرنے کو قفس میں دام سے چھوڑا ہمیں
کیا کہیں کیوں رہ گئے حیران تجھ کو دیکھ کر   آگیا دل یاد اے آئینہ رو اپنا ہمیں
دست بوسی پر کر و ہاں قتل اپنے ہاتھ سے   سچ تو کہتے ہیں قبول انصاف غیروں کا ہمیں

مومن ان کا تو نہ تھا ملنے میں آخر اختیار
یہ شکایت بھی خدا سے ہے بتوں سے کیا ہمیں

•

چین آتا ہی نہیں سوتے ہیں جس پہلو ہمیں   ہوش کیوں جلتے رہے اور دم ہوا کیوں ہو چلا

•

اضطرابِ دل غرض جینے نہ دے گا تو ہمیں   تجھ سے اے بادِ صبا آئی یہ کس کی بو ہمیں

گر یہی شوقِ شہادت ہے تو موتن جی چکے ‏ مار ڈالے کاش کوئی کافرِ دلجو ہمیں

○

نکنکی لگائی ہے اب تو گو ہو رسوائی ‏ تا وہ گر ادھر دیکھیں مجھ کو دیکھتا دیکھیں
کس نے اور کو دیکھا کس کی آنکھ جھپکی ہے ‏ دیکھنا ادھر آؤ پھر نظر ملا دیکھیں

○

بزم میں اس کی بیانِ دردو غم کیونکر کریں ‏ وہ خفا جس بات سے ہووے وہ ہم کیونکر کریں
مجھ پہ بعدِ امتحاں بھی جور کم کیوں کر کریں ‏ وہ ستائیں غیر کو ایسا ستم کیوں کر کریں
سب کو ہوتا ہے جہاں میں پاس اپنے نام کا
ہم بھی تو موتن ہیں دل نذرِ صنم کیونکر کریں

○

ہے جلوہ ریزِ نورِ نظر گردِ راہ میں ‏ آنکھیں ہیں کس کی فرش تری جلوہ گاہ میں
کیا رحم کھا کے غیر نے دی تھی دعائے وصل ‏ ظالم کہاں وگرنہ اثر میری آہ میں
جانے دے چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بلا ‏ وہ کیوں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں
ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا ‏ جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں
موتن کو سچ ہے دولتِ دنیا و دیں نصیب
شب بتکدے میں گزرے ہے دن خانقاہ میں

○

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں ‏ ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں
خسرو عیشِ وصلِ یار جانکنی اور کوہکن ‏ اپنا جگر تو خوں ہوا عشق کے امتیاز میں
کیا سبھی سینے جل چکے کیا سبھی دل پگھل چکے
بوئے کباب اب نہیں آہ جگر گداز میں

○

جیبِ درست لائقِ لطف و کرم نہیں ‏ ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں
اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں
فریاد نالہ ہائے عزا بار پر انھیں
آیا ہے رحم کب کہ ذرا مجھ میں دم نہیں
بے التفاتیاں جو عدو سے سنی نہ تھیں
ہم جانتے تھے وصل میں رنج و الم نہیں
بے جرم پائمال عدو کو کیا، کیا
مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں
ہوں آب آب اف ری نگہ ہائے گرم گرم
اس مہروش کے سامنے آنکھوں میں نم نہیں
نام وصال لینے سے ہوتا ہے مضطرب
کیونکر کہوں اسے مرے مرنے کا غم نہیں
ناصح کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں
سچ ہے کہ مجھ میں طاقتِ جور و ستم نہیں

●

دن بھی دراز رات بھی کیوں ہے فراقِ یار میں
کاہے سے فرق آگیا گردشِ روزگار میں
پوچھا ہے اس نے کیا مری بیخودی و قلق کا حال
ہوش نہیں حواس میں تاب نہیں قرار میں
مرگ ہے انتہائے عشق یاں رہی ابتدائے شوق
زندگی اپنی ہوگئی رنجشِ بار بار میں
خاک اڑائی گل نے یہ کس کے جنونِ عشق میں
آتی ہے کچھ اڑی ہوئی بادِ صبا غبار میں
دھیان میں مومن آگئے مبحثِ جبر و اختیار
قابوئے یار میں ہیں ہم، وہ نہیں اختیار میں

●

ملنے نہ مانے منعِ تپش ہائے دل کروں
میں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں
ہو جان بھی جو کچھ تو مداوائے دل کروں
کب تک میں دل پہ ہاتھ دھرے ہائے دل کروں

●

نالہ ہی نکلے ہے گو ہم مدعا کہنے کو ہیں
لب نہیں کھلنے میں اب کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب برا کہنے کو ہیں
شکوہ حرفِ تلخ کا یا شور بختی کا گلہ
ہم جو کچھ کہنے کو ہیں سو بے مزا کہنے کو ہیں
میں گلہ کرتا ہوں اپنا تو نہ سن غیروں کی بات
ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں

غیر سے سرگوشیاں کرلیجیے پھر ہم بھی کچھ — آرزو ہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں
ترجمانِ التماسِ شوق ہے تغییرِ رنگ — جوں زبانِ شمع عاشق بے صدا کہنے کو ہیں
ہو گئے نام بتاں سنتے ہی مومنؔ بے قرار
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

•

وہ علی الرغم عدو مجھ پہ کرم کرتے ہیں — ہے ستم لطف کے پردے میں ستم کرتے ہیں
نیم بسمل ہیں نہ چھیڑا ے تپشِ دل کہ ابھی — روے قاتل کا نظارہ کوئی دم کرتے ہیں
اے اجل کاش الٹ جائیں شبِ ہجراں میں — وہ دعائیں کہ تری جان کو ہم کرتے ہیں
کشتۂ یار ہوں اس رشک سے مرتا ہے جہاں — وہ بھی کیا ہیں جو مری موت کا غم کرتے ہیں
آبرو رہ گئی مرنے کی کہ روتے تو ہیں وہ — اشکِ شادی ہی سے گو چشم کو نم کرتے ہیں
جاکے کعبے میں بھی مومنؔ نہ گئی دیر کی یاد
جاے لبیک صدا ہاے صنم کرتے ہیں

•

نیرنگِ عشق سے نہ ہو غافل ہے ایک رنگ — اس دل کے جاگنے میں زلیخا کے خواب میں

•

دکھاتے آینہ ہو اور مجھ میں جان نہیں — کہو گے پھر بھی کہ میں تجھ سا بدگمان نہیں
جو یار صلح پہ ہے اب تو آسمان نہیں — وہ مہربان ہوا تو یہ مہربان نہیں
ترے فراق میں آرام ایک آن نہیں — یہ ہم سمجھ چکے گر تو نہیں تو جان نہیں
نہ چاہوں روزِ جزا داد یہ ستم دیکھو — کب آزماتے ہیں جب وقتِ امتحان نہیں
نہ کیوں نثار ہو جاں فرطِ کینِ جاناں پر — کہ اس کو میرے سوا اور کا دھیان نہیں
نکل کے دیر سے مسجد میں جا رہ اے مومنؔ
خدا کا گھر تو ہے تیرے اگر مکاں نہیں

•

ہجراں میں بھی زیست کیوں نہ چاہوں — جاں دادۂ شوخیِ بے وفا ہوں
کیا شکوہ جفائے آسماں کا — میں آپ کو دور کھینچتا ہوں
دشمن سے ہے چشمِ مہربانی — محرومِ نگاہِ آشنا ہوں
خود بینی و بیخودی میں ہے فرق — میں تم سے زیادہ کم نما ہوں
مجھ رمز شناس سے یہ باتیں — کیا خوب ہیں غیر سے برا ہوں
اے کاش عدو کو غیرت آوے — میں منتظر اپنی موت کا ہوں

اس نام کے صدقے جس کی دولت
مومن رہوں اور بتوں کو چاہوں

•

ہر دم رہینِ کشمکشِ دستِ یار ہیں — چلون کے بند کس کے گریباں کے تار ہیں
کیا کیجیے کہ طاقتِ نظارہ ہی نہیں — جتنے وہ بے حجاب ہیں، ہم شرمسار ہیں
شبنم خرابِ مہر کتاں سینہ چاکِ ماہ — تو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں
کیسے گلے رقیب کے کیا طعنِ اقربا — تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

ناصح سے مجھ کو کیونکے نہ ہوں بدگمانیاں
دشمن ہیں جو مرے وہ ترے دوستدار ہیں

•

آہِ فلک فگن ترے غم سے کہاں نہیں — جو فتنہ خیز اب ہے زمیں آسماں نہیں
کہنا پڑا مجھے پئے الزامِ پند گو — وہ ماجرا جو لائقِ شرح و بیاں نہیں
ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں
باتیں تری وہ ہوش ربا ہیں کہ کیا کہوں — جو کوئی رازداں ہے مرا رازداں نہیں
پیشِ عدو سمجھ کے ذرا حال پوچھنا — قابو میں دل نہیں مرے بس میں زباں نہیں
کرتے وفا امیدِ وفا پر تمام عمر — پر کیا کریں کہ اس کو سرِ امتحاں نہیں
اس کو بھی جانتا ہوں فریبِ وصالِ غیر — تم کو عبث یقیں ہے کہ میں بدگماں نہیں

میں اپنی چشمِ شوق کو الزام خاک دوں　　تیری نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں
اتنے سبک نظر میں ہیں اوضاعِ روزگار　　دنیا کی حسرتیں مرے دل پر گراں نہیں
میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا
آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

•

تاثیرِ صبر میں نہ اثر اضطراب میں　　بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں
چرخ و زمیں میں تو یہ کا ملتا نہیں سراغ　　ہنگامۂ بہار و ہجومِ سحاب میں
کھولا جو دفترِ گلہ اپنا زیاں کیا　　گزری شبِ وصال ستم کے حساب میں
اے حشر جلد کر تہ و بالا جہان کو　　یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں
مومن یہ عالم اس صنمِ جاں فزا کا ہے
دل لگ گیا جہانِ سراسر خراب میں

•

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں　　سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
چینِ جبیں کو دیکھ کر دل بستہ تر ہوا　　کیسی کشودِ کار کشادِ نقاب میں
رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام　　آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں
بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہو چکے　　اب عذر کیا رہا نگہِ بے حجاب میں
مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کر دیا　　حسرت بھی اب نہیں دلِ ناکامیاب میں
دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش　　وہ ہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں
کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں　　بے بادہ مست ہوں میں شبِ ماہتاب میں
ہے منتوں کا وقت شکایت رہی رہی　　آنے تو ہیں منانے کو وہ پر عتاب میں
تیری جفا نہ ہو تو ہے سب دشمنوں سے امن　　بدمست غیر محو دل اور بخت خواب میں
پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

ہیم بیداد وستم کچھ دلِ مضطر میں نہیں یوں ہوں نالاں کہ وہ گو یاصفِ محشر میں نہیں
مجھ سے میکش کی طرف محتسب آتا ہے تو آئے ایک قطرہ بھی سبو و خم و ساغر میں نہیں
قطعِ امید سے سر کاٹنے کو کیا نسبت مجھ میں وہ دم ہے ابھی جو ترے خنجر میں نہیں
کیا مؤثر ہو دعا وصلِ صنم کی مومن
ہم طلب کرتے ہیں وہ شے جو مقدر میں نہیں

•

مجھ کو کیا کام کہ آئینے کی حیرت دیکھوں دیکھ تو آئینہ اور میں تری صورت دیکھوں

•

جن سے منظور وفا ہے ہو جفا بھی ان پر مجھ سے کچھ کام نہیں ہے تو ستاتے کیوں ہو
توڑنا جان کا ہو جائے گا دشوار آخر چارہ سازو مری امید بندھاتے کیوں ہو
کھل گیا عشقِ صنم طرزِ سخن سے مومن
اب چھپاتے ہو عبث بات بناتے کیوں ہو

•

کیسے مجھ سے بگڑے تم اللہ اکبر رات کو ذبح ہی کرتے جو ہوتا پاس خنجر رات کو
بزمِ دشمن میں نہ ہو وہ نغمہ گر آتی رہی ہر فغاں کے ساتھ لب پر جانِ مضطر رات کو
یاد دلوائی تپش نے تیری شوخی وصل کی مر گئے ہم دیکھ کر چیں ہائے بستر رات کو
کیا اسی بت خانے کو فرماتے ہو ظلمت کدہ
حضرتِ مومن جہاں جاتے ہو چھپ کر رات کو

•

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو ہے بوالہوسوں پر بھی ستم، ناز تو دیکھو
چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرت ناصح طرزِ نگہِ چشمِ فسوں ساز تو دیکھو
اربابِ ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے کم طالعیِ عاشقِ جاں باز تو دیکھو
مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ بدنامیِ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو
دیں پاکیِ دامن کی گواہی مرے آنسو — اس یوسفِ بیدرد کا اعجاز تو دیکھو

جنت میں بھی مومنؔ نہ ملا ہائے بتوں سے
جورِ اجلِ تفرقہ پرداز تو دیکھو

●

وفا سکھلا رہے گا دل ہمارا — تمھاری خاطرِ نامہرباں کو
کہاں ہے تابِ نازِ برق اے کاش — جلادے آتشِ گل آشیاں کو
سمجھتا کیونکے دیوانے کی باتیں — نہ پایا محرم اپنے رازداں کو
ہمارا غش تو کیا مر جائیں تو بھی — نہ کھولے طرۂ عنبر فشاں کو
دلِ مضطر کی بے تابی نے مارا — کہاں سے لاؤں اس آرامِ جاں کو

سن اے مومنؔ یہ ایماں ہے ہمارا
نہ کہنا کفر پھر عشقِ بتاں کو

●

پروانہ دار گرمِ تپش ہیں خلق سے ہم — تم شوخیوں سے شعلۂ بیتاب جستہ ہو
مومن نہ توڑ رشتۂ زنارِ برہمن — مت کرو وہ بات جس سے کوئی دل شکستہ ہو

●

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر — مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں — وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی میں گفتگو — وہ بیان شوق کا برملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دمبدم — گلۂ ملامتِ اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی — تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی — کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا ایک آپ نے وعدہ تھا   سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

●

بادِ بہار میں ہے کچھ اور عطر ریزی   تم آجکل میں شاید سوے چمن گئے ہو
ہے کچھ تو بات مومن جو چھا گئی خموشی   کس بت کو دے دیا دل کیوں بت سے بن گئے ہو

●

اے ناصحو آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو   ہم کو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو
دن رات فکرِ جور میں یوں رنج اٹھانا کب تلک   میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو
مومن تم اور عشقِ بتاں اے پیر و مرشد خیر ہے   یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

●

وہ آئے یا نہ آئے زیست میری ہو نہ ہو لیکن   ذرا اے چارہ سازو رحمتِ تدبیر تو کھینچو
دکھا دوں گا تماشا بس نہ چھیڑو مجھ سے مجنوں کو   ہلا دوں گا زمین و آسماں زنجیر تو کھینچو

●

اعجازِ جاں دہی ہے ہمارے کلام کو   زندہ کیا ہے ہم نے مسیحا کے نام کو
لکھو سلام غیر کے خط میں غلام کو   بندے کا بس سلام ہے ایسے سلام کو
اب شور ہے مثال جو دی اُس خرام کو   یوں کون جانتا تھا قیامت کے نام کو
گو آپ نے جواب بُرا ہی دیا ولے   مجھ سے بیاں نہ کیجے عدو کے پیام کو
مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اُس شعرا کے امام کو

●

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو   عذر کچھ چاہیے ستانے کو
صبحِ عشرت ہے وہ نہ شامِ وصال   ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

برق کا آسمان پر ہے دماغ　　پھونک کر میرے آشیانے کو
شکوہ ہے غیر کی کدورت کا　　سو مرے خاک میں ملانے کو
سن کے وصف اُس پہ مر گیا ہمدم　　خوب آیا تھا غم اُٹھانے کو
کوئی دن ہم جہاں میں بیٹھے ہیں
آسماں کے ستم اُٹھانے کو

●

صد حیف سینہ سوزِ فغاں کارگر نہ ہو　　یاں جان پر بنے ترے دل میں اثر نہ ہو
ایسے سے قدرِ مہر و وفا کی اُمید کیا　　جس کو ہنوز اپنے ستم کی خبر نہ ہو
پائے طلب شکستہ نہ کوتاہ دستِ شوق　　ہم بھی ستم کریں جو وہ نازک کمر نہ ہو
فریادِ بے گناہ کشی جابجا کروں　　گرو ہم جہاں نشاریِ پیغام بر نہ ہو
عابد فریب شوخی و رغبت فزا نگاہ　　میں کیا کسی سے صبر تجھے دیکھ کر نہ ہو
سودا ہے مجھ کو گرمیِ بازارِ عشق کا　　اس کا کہاں خیال کہ اپنا ضرر نہ ہو
حزن و ملال میں ہے دل آزردگی کا وہم　　کیسی بری بنے جو گلہ بے اثر نہ ہو
ہیں آرزو سے مرگ کی بے التفاتیاں　　جینا مرا محال تو دشمن اگر نہ ہو
اب کیجیے آہِ تاب گسل ہر جفا کے ساتھ　　جب جان سے گزر گئے پھر درگذر نہ ہو
سوتے سے اُٹھکے آئے ہیں یارب نہ جائیں وہ
شرمندہ آہ شب سے دعائے سحر نہ ہو

●

اعجاز سے زیادہ ہے سحر اس کے ناز کا　　آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لبِ بیاں نہ ہو
کرنی نہ تھیں بگاڑ کی باتیں گلہ میں ہائے　　کیسی بنے جو دل سے وہ نامہرباں نہ ہو
عزمِ سفر جہاں سے کروں کیا شبِ فراق　　میں جانتا ہوں چین کہاں تو جہاں نہ ہو
مومن بہشت و عشقِ حقیقی تمھیں نصیب
ہم کو تو رنج ہو جو غمِ جاوداں نہ ہو

کب تک سیوں پارہ پارہ دل کو　　رخصت ہے شکیبِ جاں گسل کو
تھا ضعف بھی طاقت آزمارات　　توڑا کیے جانِ مضمحل کو

•

اک لحظہ نہیں قرار جی کو　　موت آئے بس ایسی زندگی کو
اُس آفتِ جاں کو دل دیا ہاے　　جو عیب گنے ہے دل دہی کو
کوئی نہ رہا جو پونچھے آنسو
کیا روؤں میں اپنی بیکسی کو

•

جلوہ اُس بت نے دکھایا مجھکو　　کب قیامت میں غش آیا مجھکو

چل پرے ہٹ مجھے نہ دکھلا منہ　　اے شبِ ہجر تیرا کالا منہ
آرزوے نظارہ تھی تونے　　اتنی ہی بات پر چھپایا منہ
ہو گیا رازِ عشق بے پردہ
اس نے پردے سے جو نکالا منہ

سمارہے ہیں مگر تیرے نو بنو جلوے　　کہ بن گیا ہے طلسمِ بہار آئینہ
شکستِ رنگ پہ مستی میں ہنستے ہیں ہم بھی　　دکھائیں گے انھیں وقتِ خمار آئینہ
مجھے تو کہتے ہو مت دیکھ میری جانب تو
اور آپ دیکھتے ہو بار بار آئینہ

•

سیماب ہے پہلو میں مرے دل تو نہیں یہ　　اس دل نے ستایا مجھے غارت ہو کہیں یہ
حسرت سے کہا خضر نے دیکھ اُس کی گلی کو　　مرتا ہوں ابھی گر ملے مدفن کو زمیں یہ
اس رحم کے صدقے دمِ گھبرا کے کہا ہاں
جا کر کوئی دیکھو کہیں مومن تو نہیں یہ

کب تک تپاک ہے بتِ نا آشنا کے ساتھ — کیجے وفا کہاں تلک اس بے وفا کے ساتھ
مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی — آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی — ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ
یا رب وصالِ یار میں کیونکر ہو زندگی — نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ
سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر — یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ
ہر دم عرق عرق نگہِ بے حجاب ہے — کس نے نگاہ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ
مرنے کے بعد بھی وہی آوارگی رہی — افسوس جاں گئی نفسِ نارسا کے ساتھ
دستِ جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا — اُلجھا ہے اُن سے شوخ کے بندِ قبا کے ساتھ

میں کینے سے بھی خوش ہوں کہ سب یہ تو کہتے ہیں
اُس فتنہ گر کو لاگ ہے اس مبتلا کے ساتھ

•

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ — بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ
آتی ہے بوئے داغ شبِ تارِ ہجر سے — سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ
تھے وعدے سے پھر آنے کے خوش یہ خبر نہ تھی — ہے اپنی زندگانی اسی بے وفا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

•

گر نازکی سے بار ہے دشنہ تو یک نگاہ — ہم نیم بسملوں کو تڑپتا نہ چھوڑ دیکھ
آئینہ خانہ بن گیا دل توڑنا نہ تھا — یعنی اب ایسے جلوہ نما ہیں کروڑ دیکھ

•

کھائی ہے قسم ہم نے کہ پرہیز کریں گے — گر درد سے بھر جائے طبیعت تو مزا ہے
توبہ گنہ عشق سے فرمائے ہے واعظ — یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے
تھا محوِ رخِ یار میں کیا آئینہ دیکھوں — معلوم ہے یاروں مجھے جو رنگ مرا ہے

مومن نہ سہی بوسۂ پا، سجدہ کریں گے
وہ بُت ہے جو اوروں کا تو اپنا بھی خدا ہے

•

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی
خبر ہے لاش پہ اس بے وفا کے آنے کی

ہے ایک خلق کا خوں سر پہ اشک خوں کے مرے
سکھائی طرز آسے دامن اُٹھا کے آنے کی

سمجھ کے اور ہی کچھ مر چلا میں اے ناصح
کہا جو تو نے نہیں جان جا کے آنے کی

مجھے یہ ڈر ہے کہ مومن کہیں نہ کہتا ہو
مری تسلی کو روزِ جزا کے آنے کی

•

میں اگر آپ سے جاؤں تو قرار آجائے
پھر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو یار آجائے

کلفتِ ہجر کو کیا روؤں ترے سامنے میں
دل جو خالی ہو تو آنکھوں میں غبار آجائے

محوِ دلدار ہوں کس طرح نہ ہوں دشمنِ جاں
مجھ پہ جب ناصحِ بیدرد کو پیار آجائے

•

دیتے ہو تسکیں مرے آزار سے
دوستی تم کو نہیں اغیار سے

مجھ سے وہ چھپتے پھریں اس کے سوا
اور حاصل عشق کے آزار سے

کر علاجِ وحشتِ دل چارہ گر
لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

ذکرِ اشکِ غیر میں رنگینیاں
بوے خوں آئی تری گفتار سے

گر دعا کرتا ہوں مومن وصل کی
ہاتھ باندھے ہے وہ بُت زنّار سے

•

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے
یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

سامنے سے جب وہ شوخِ دلربا آجائے ہے
تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

حالِ دل کیونکر کہوں ہیں کس سے بولا جائے ہے
سر اُٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے

جاں نہ کھا وصلِ عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے ہیں حیران ہوں
کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

تاب و طاقت صبر و راحت جان و ایمان عقل و ہوش
ہائے کیا کہیے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

خاک ہیں مل جائے یارب بے کسی کی آبرو
غیر میری نعش کے ہمراہ روتا جائے ہے

دیکھیے انجام کیا ہو مومن صورت پرست
شیخِ صنعاں کی طرح سوئے کلیسا جائے ہے

●

ہوئی تاثیر آہ و زاری کی
رہ گئی بات بے قراری کی

شکوۂ دشمنی کریں کس سے
واں شکایت ہے دوست داری کی

یاس دیکھو کہ غیر سے کہہ دی
بات اپنی امید داری کی

●

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہوں گے

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

ناصحا دل ہیں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں
گر وہ ہوں گے بھی تو بے وقت پشیماں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سن اے موجِ ہوا بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

صبر یارب مری وحشت کا پڑے گا کہ نہیں
چارہ فرما بھی کبھی قیدیِ زنداں ہوں گے

منتِ حضرت عیسیٰ نہ اُٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے

چاکِ پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی　　پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

●

آج اس بزم میں طوفان اٹھا کے اُٹھے　　یاں تلک روئے کہ اس کو بھی رُلا کے اُٹھے
گر نہ ہو دل میں خیالِ نگہِ خواب آلود　　درد کیا کیا اثرِ خفتہ جگا کے اُٹھے
گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اک حرفِ غلط　　لیک اُٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اُٹھے
ہو عذابِ شبِ یلدا سے رہائی یارب　　زلف منہ سے کہیں اس مہر لقا کے اُٹھے
اُف ری گرمیٔ محبت کہ ترے سوختہ جاں　　جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اُٹھے
میں دکھاتا نہیں تاثیر مگر ہاتھ مرے　　ضعف کے ہاتھ سے کب وقتِ دعا کے اُٹھے
جی ہی مانندِ نشانِ کفِ پا بیٹھ گیا　　پاؤں کیا کوچے سے اس ہوش ربا کے اُٹھے

شعر مومنؔ کے پڑھے بیٹھ کے اس کے آگے
خوب احوالِ دلِ زار سُنا کے اُٹھے

●

لازم تھا حذر مجھ سے ناچیز کے نالوں سے　　پر مجھ کو کہاں غیرت لے بے اثری اتنی
بے پردہ پسِ چلون یکبار نہ تم آ بیٹھے　　بے تابِ نظر کس کو کیوں جلوہ گری اتنی
تم اُٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا　　سایہ سے مرے وحشت لے رشکِ پری اتنی
یہ کون کہے اس سے کی ترکِ وفا میں نے　　کر تو ہی ذرا ناصح پیغام بری اتنی
کہتا ہے مرے آگے وہ، مجھ پہ عدو غش ہے　　ہے ہے مری اُلفت سے ہے بیخبری اتنی

سجدہ نہ کہیں کرنا مومنؔ قدمِ بُت پر
کعبے ہی میں ہوتی ہے بیہودہ سری اتنی

●

منتظر کس کے یہ رہتے ہیں کہ ہم ہر شب کو　　تا سحر شام سے اُٹھ اُٹھ کے ہیں گھر میں پھرتے

جنبشِ نرگسِ جنّت نے رُلایا مومن ۔۔۔ چشمِ کافر کے اشارے میں نظر میں پھرتے

●

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے ۔۔۔ اُس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے
چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی ۔۔۔ ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

●

وہ سر جو کل ترے زانو پہ تھا سو آج اے ظالم ۔۔۔ کبھو رہتا ہے پتھر پر کبھو رہتا زمیں پر ہے

●

دیا ظالم کو دل، جاں غیر کو آرام وحشت کو ۔۔۔ کسی کا شکوہ کیا کیجیے یہ خوبی اپنی قسمت کی
ستم پیشہ۔ بد خو ہے ستمگر ہے جفا جو ہے ۔۔۔ کروں کیا کیا شکایت دوستو اس بے مروّت کی
مبارک خفتگانِ خاک کو تصدیعِ بیداری ۔۔۔ کہ گورِ تیرہ سے یاد آئی مجھ کو رات فرقت کی
جفا کا شکوہ اب کیوں جو کیا اچھا کیا اس نے
سزا ہے اے دلِ ناداں اس الفت اس محبت کی

●

مجھ کو مارا مرے حالِ متغیّر نے کہ ہے ۔۔۔ کچھ گماں اور ہی دھڑکے سے دلِ مونس کے
بختِ پروانہ سے قربان عدو ہو یعنی ۔۔۔ آگ بن جائے ہے وہ گرد پھر دل میں جس کے

●

مجھ پہ طوفاں اُٹھائے لوگوں نے ۔۔۔ مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے
کر دیا مومن اس صنم کو خفا ۔۔۔ کیا کیا ہائے ہائے لوگوں نے

●

تمہیں تقصیر اس بت کی کہ ہے میری خطا لگتی ۔۔۔ مسلمانو ذرا انصاف سے کہیو خدا لگتی
تڑپنے لوٹنے رونے کا باعث تجھ پہ بھی کھلتا ۔۔۔ ترے دل کو بھی میری سی اگر اے بے وفا لگتی

●

جب وہ حیرت زدہ چہرے پہ نظر کرتا ہے ۔۔۔ آئینہ صد گلۂ آئینہ گر کرتا ہے

کیا کیا دل نے کہ آنکھوں سے کہا رازِ نہاں　ایسے غماز کو بھی کوئی خبر کرتا ہے
عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو　کہ شبِ غم کوئی کس طور سحر کرتا ہے
بختِ بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں　تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے
ذکر کر بیٹھے بُرائی ہی سے شاید میرا　اب وہ اغیار کی صحبت سے حذر کرتا ہے
اشکِ شادی نے دمِ وصل جلایا مجھ کو　منعِ نظارہ مرا دیدۂ تر کرتا ہے
کیا رُلاتی ہے مجھے فکرِ خیالِ دشمن
وصل میں جب وہ ادھر ہنسکے نظر کرتا ہے

●

فغاں کیا دم بھی لیتا پارہ ہائے دل اڑاتا ہے　کہوں کیا دردِ پنہاں کی، کلیجا منہ کو آتا ہے
گراں خوابی وہی ہے بختِ خوابیدہ کی اے ظالم　مرا شورِ فغاں کاہے کو سوتوں کو جگاتا ہے
میں ایسا ہوں کہ دوں گا تجھ کو طعنہ بیوفائی کا　بگڑنا گر نہیں دشمن سے کیوں باتیں بناتا ہے
خیالِ خواب راحت ہے علاج اس بدگمانی کا
وہ کافر گور میں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے

●

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے　کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ　غش تمہیں دیکھ کر نہ ہو جائے
کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم　کہیں پامالِ سر نہ ہو جائے
میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ　تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں　کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے
مانعِ ظلم ہے تغافلِ یار　بختِ بد کو خبر نہ ہو جائے
غیر سے بے حجاب ملتے ہو　شبِ عاشق سحر نہ ہو جائے
اے دل آہستہ آہِ تاب شکن　دیکھ ٹکڑے جگر نہ ہو جائے
مومن ایماں قبول دل سے مجھے
وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

جہاں سے شکل کو تیری ترس ترس گزرے | جو تجھ پہ بس نہ چلا اپنے جی سے بس گزرے
نہ جاؤں کیونکے سوے دام آشیانے سے جب | خیال حسرتِ مرغان ہم قفس گزرے
وفائے غیرتِ شکر جفا نے کام کیا | کہ اب ہوس سے بھی اعدائے بوالہوس گزرے
یہ نیم جان و غم ہجر ہے وہی انصاف | جو تیرے دھیان میں لے رگِ داد رس گزرے

کہاں وہ ربط بتاں اب کہ اس کو تو مومن
ہزار سال ہوئے سیکڑوں برس گزرے

•

نہ انتظار میں یاں آنکھ ایک آن لگی | نہ ہائے ہائے میں تالو سے شب زبان لگی
جفائے غیر کا شکوہ تھا تیرا تھا کیا ذکر | عبث یہ بات بری تجھ کو بدگمان لگی

میں اور اس کو بلاؤں گا روزِ وصل میں لو
اجل بھی کرنے محبت کا امتحان لگی

•

کیا مرے قتل پہ حامی کوئی جلاد بھرے | آہ جب دیکھ کے تجھ سا ستم ایجاد بھرے
کہیں ہوجائے وصال آہ بلا سے چھوٹوں | ہجر کا دکھ کوئی کب تک دلِ ناشاد بھرے
ہوں میں وہ صیدِ جگر خونِ اسیری مشتاق | جو پسِ ذبح بھی ہر دم دم صیاد بھرے

چارہ گر اس کی خطا کیا مرے تن میں نہ رہا
خون اتنا کہ سرِ نشترِ فصاد بھرے

•

کرتا ہے قتلِ عام وہ اغیار کے لیے | دس بیس روز مرتے ہیں دو چار کے لیے
دل عشق تیری نذر کیا جان کیونکے دوں | رکھا ہے اس کو حسرتِ دیدار کے لیے
چلنا تو دیکھنا کہ قیامت نے بھی قدم | طرزِ خرام و شوخیِ رفتار کے لیے

جینا امیدِ وصل پہ ہجراں میں سہل تھا
مرتا ہوں زندگانیِ دشوار کے لیے

کہاں تک دم بخود رہیے نہ ہوں کیجے نہ ہاں کیجے　　کہاں تک کھائیے غم کب تلک ضبطِ فغاں کیجے

عدو کے وہم سے تکتا ہوں بزمِ غیر میں ہر سو　　نہیں ہے اور کچھ یوں آپ جو چاہیں گماں کیجے

نہیں تو کیا کہیں اور بن کہے کیونکر دوا ہووے　　بڑی مشکل پڑی کیا چارۂ دردِ نہاں کیجے

رکھے ہے ہاتھ سینے پر بھلا کب مانتا ہے دل　　نہ جب تک رو دیے دو چار آہِ خوں چکاں کیجے

کچھ آخر حد بھی ہے جور و جفا و ظلم کی کب تک　　تحمل در گزر ہر لحظہ ہر دم ہر زماں کیجے

گلا ہم کاٹ لیں گے آپ تیغِ رشک سے اپنا　　عدو کو قتل کیجے پھر ہمارا امتحاں کیجے

عذابِ ایزدی جانکاہ ہے مانا بس اے مومن
خدا کے واسطے ذکرِ ستم ہائے بتاں کیجے

●

اجل سے خوش ہوں کسی طرح ہو وصال تو ہے　　نہ آئے نعش پہ وہ پر یہ احتمال تو ہے

ذرا تھم اے دلِ مضطر کہ فکرِ وصل کروں　　شبِ قلق نہ سہی خواب بھی خیال تو ہے

کہاں تلک گلہ ہائے تغافلِ قاتل　　ہم آپ کاٹ لیں آخر یہ سر، وبال تو ہے

جفائے یار کو سونپا معاملہ اپنا　　اب آگے ہو نہ ہو امیدِ انفصال تو ہے

شبِ فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں　　کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

عبث ترقیِ فن کی ہوس ہے مومن کو
زیادہ ہوئے گا کیا اس سے بے مثال تو ہے

●

تسلی دمِ واپسیں ہو چکی　　ہمیں ہو چکے جب نہیں ہو چکی

قلق کشتۂ سخت جانی ہے پھر　　امیدِ اجل آفریں ہو چکی

بلا اس سیہ روز کو بزم میں　　شبِ عیش اے مہ جبیں ہو چکی

خیالِ اجل سے تسلی کروں
وہ طاقت بھی جانِ حزیں ہو چکی

●

در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے　　وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے
ہو کے آزردہ پشیماں ہوں کہ میں جس سے کہوں　　وہی کہوے کوئی ایسے سے خفا ہوتا ہے

نہ ہو بیتاب غم ہجر بتاں میں مومن
دیکھ دو دن میں بس اب فضل خدا ہوتا ہے

●

کیونکر یہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے　　کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے
ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی مرے قتل کی باتیں　　اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کریں گے
بیمار اجل چارہ کو گر حضرت عیسیٰ　　اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے
دیوار کے گر پڑتے ہی اٹھنے لگے طوفاں　　اب بیٹھ کے کونے میں بھی رویا نہ کریں گے

ناصح کف افسوس نہ مل چل تجھے کیا کام
پامال کریں گے وہ مجھے یا نہ کریں گے

●

گر ذکر دنا سے یہی غصہ ہے تو اب سے　　گو قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کریں گے

●

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے　　وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے
اے حضرت مومن یہ مسلم جو ہے ارشاد　　بھولے سے بھی اب ذکر بتوں کا نہ کریں گے

لیکن جو بتوں نے ہی بھلا آپ سے کی بات
پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کریں گے

●

نہ کٹی ہم سے شب جدائی کی　　کتنی ہی طاقت آزمائی کی
رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے　　میں نے ہی تم سے بے وفائی کی
دام عاشق ہے دل دہی نہ ستم　　دل کو چھینا تو دلربائی کی
گر نہ بگڑو تو کیا بگڑتا ہے　　مجھ میں طاقت نہیں لڑائی کی

گھر تو اس ماہ وش کا دور نہ تھا ‏ ‏ لیک طالع نے نارسائی کی

مر گئے پر بے خبر صیاد ‏ ‏ اب توقع نہیں رہائی کی

مومن آؤ تمہیں بھی دکھلا دوں

سیر بت خانے میں خدائی کی

●

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے ‏ ‏ کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

پوچھا کسی پہ مرتے ہو اور دم نکل گیا ‏ ‏ ہم جان سے عنان بہ عنان صدا گئے

اے آبِ اشک آتشِ عنصر ہے دیکھنا ‏ ‏ جی ہی گیا اگر نفسِ شعلہ زا گئے

واعظ کے ذکرِ مہرِ قیامت کو کیا کہوں ‏ ‏ عالم شبِ وصال کے آنکھوں میں چھا گئے

تابندہ جوان تو بختِ رقیب تھے ‏ ‏ ہم تیرہ روز کیوں غمِ ہجراں کو بھا گئے

اے مومن آپ کب سے ہوئے بندۂ بتاں

بارے ہمارے دین میں حضرت بھی آ گئے

●

خود رفتگی میں چین وہ پایا کہ کیا کہوں ‏ ‏ غربت جو مجھ سے پوچھو تو بہتر وطن سے ہے

کیا کیا جوابِ شکوہ میں باتیں بنا گیا ‏ ‏ لو اب بھی دل درست اسی دل شکن سے ہے

●

بے وفائی کا عدو کی ہے گلہ ‏ ‏ لطف میں بھی وہ ستاتے ہیں مجھے

حیرتِ حسن سے یہ شکل بنی ‏ ‏ کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں ‏ ‏ تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

پھونک دے آتشِ دل داغ مرے ‏ ‏ اس کی خود یاد دلاتے ہیں مجھے

مومن اور دیر خدا خیر کرے

طور بے ڈھب نظر آتے ہیں مجھے

●

پھر دل ہے داغ مطلعِ خورشید دیکھ کر — ازبس کہ یاد جلوۂ بالائے بام ہے
اس آہوئے رمیدہ کو پھر ڈھونڈتا ہے دل — رم کردہ شوقِ وصل پھر اک صیدِ رام ہے
پھر آگیا ہے کون سے بے باک کا خیال — یہ کیا ہوا کہ رخصتِ ناموس و نام ہے
پھر کس نے غیر کو نہ دیا ناز سے جواب — پھر خواہشِ پیامِ اجل کا پیام ہے
دیکھا نگاہِ ناز سے کس شوخ چشم نے — پھر مضطرب نظر کو جہاں نیم گام ہے
پھر کس ستم شعار نے پوچھا ہے میرا حال — پھر ناصحوں کو کیوں خطرِ انتقام ہے
پھر کچھ صدائے پا سے دلِ مردہ جی اٹھا — پھر جلوہ ریز کون قیامت خرام ہے

پھر دورئ بتاں میں نہیں خواب کا خیال
مومن مرے بھی دین میں سونا حرام ہے

●

مجھے چپ لگی مدعا کہتے کہتے — رکے ہیں وہ کیا جانے کیا کہتے کہتے
شبِ ہجر میں کیا ہجومِ بلا ہے — زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے
چلے تم کہاں میں نے تو دم لیا ہے — فسانہ دلِ زار کا کہتے کہتے

●

یوں بنا کر حالِ دل کہنا نہ تھا — بات بگڑی میری ہی تقریر سے
لے گئی جاں یادِ رونق ہائے وصل — گھر مرا ویراں ہوا تعمیر سے
اے صنم مومن ہوں آخر کس طرح — مجھ کو تسکیں ہو تری تصویر سے

●

ہم حال کہے جائیں گے سنیے کہ نہ سنیے — اتنا ہی تو یاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے
وہ ذبح کرے اور یہاں جان فدا ہو — ایسے سے نبھے یوں یہ ہمارا ہی جگر ہے

دل کھول کے مل لیجیے مومن صنموں سے
اس سال میں گر سوئے حرم عزمِ سفر ہے

●

دل میں اس شوخ کے جو راہ نہ کی — ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی

کون ایسا کہ اس سے پوچھے کیوں — پرسشِ حالِ داد خواہ نہ کی
تھا بہت شوقِ وصل تو نے تو — کمی اے حسن تاب گاہ نہ کی
تاب کم ظرف کو کہاں تم نے — دشمنی کی عدو سے چاہ نہ کی
گریہ و آہ بے اثر دونوں — کس نے کشتی مری تباہ نہ کی
تھا مقدر میں اس سے کم ملنا — کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی
دیکھ دشمن کو اٹھ گیا بے دید — میرے احوال پر نگاہ نہ کی

مومن اس ذہن بے خطا پر حیف
فکرِ آمرزشِ گناہ نہ کی

٭

مُنہ آسمان کا رُخ پھیر دوں جدھر چاہوں — دیا ہے کیا تپشِ دل نے اختیار مجھے
وہ شام وعدہ جو آئے تو بیخود و سرمست — رہا وصال میں بھی وہ ہی انتظار مجھے
نہ ہو وہ بات کہ جس سے وفا میں آئے خلل — کہیں نہ کیجیو ناصح سے شرمسار مجھے
بقدرِ جوشش تڑپنے کو تھا ولے پسِ قتل — وہ بے قرار ہوئے آ گیا قرار مجھے

امیدِ مرگ پہ ہر فتنہ راحتِ جاں ہے — شبِ فراق میں کیا بیمِ روزگار مجھے
اگر حسابِ وفا امتحاں کے بعد نہ ہو — قبول عذرِ ستم ہائے بے شمار مجھے
رقیب کھائے قسم تو وفا کا آئے یقیں — تو میری جان ہے کیا تیرا اعتبار مجھے
پسِ شکستن خم زجرِ محتسب معقول — گنہگار نے سمجھا گنہگار مجھے
نہ کام زور سے نکلا نہ عجز کام آیا — بس اب تو چین دے اے شوقِ ہرزہ کار مجھے
ہر آن آن دگر کا ہوا میں عاشقِ زار — وہ سادہ ایسے کہ سمجھے وفا شعار مجھے

ثوابِ ترکِ صنم سچ سہی ولے مومن
یہ کیا سبب کہ سناتے ہو بار بار مجھے

٭

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لیے
سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لیے

خلافِ وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں
امیدِ یک شبہ ہے یاس جاوداں کے لیے

سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں
کہ سخت چاہیے دل اپنے رازداں کے لیے

حجابِ چرخ بلا ہے ہوا کرے بے تاب
فغاں اثر کے لیے اور اثر فغاں کے لیے

ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لیے

مزہ یہ شکوے میں آیا کہ بے مزہ ہوئے وہ
میں تلخ کام رہا لذّتِ زباں کے لیے

ملے رقیب سے وہ جب سنا وصال ہوا
دریغ جان گئی ایسے بدگماں کے لیے

کہاں وہ عیشِ اسیری کہاں وہ امنِ قفس
ہے بیم برقِ بلا روزِ آشیاں کے لیے

جنونِ عشقِ ازل کیوں نہ خاک اڑائیں کہ ہم
جہاں میں آئے ہیں ویرانیِ جہاں کے لیے

بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے ہوئے
ہمیں بھی دینی تھی جاں اس کے امتحاں کے لیے

●

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

موئے آغازِ الفت میں ہم افسوس
اُسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی

جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا
کہ تو نے کس توقع پر وفا کی

وہ سوتے بے حجابانہ رہے اور
نگاہِ شوق کام اپنا کیا کی

کہا اس بت سے جب مرتا ہے مومؔن
کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

●

نہ ربط اس سے نہ یاری آسماں سے
جفا بہرِ عدو لاؤں کہاں سے

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے
کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے

شبِ وصل آپ کا عذرِ نزاکت
بجا ہے پر نہ مجھ سے نیم جاں سے

مرے گھر آپ یوں جاتے تھے کس دن
اُٹھانا مدعا ہے آستاں سے

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب　　تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

نہ بولوں گا نہ بولوں گا کہ میں ہوں　　زیادہ بدگماں اس بدگماں سے

نہ بجلی جلوہ فرما ہے نہ صیاد　　نکل کر کیا کریں ہم آشیاں سے

بُرا انجام ہے آغازِ بد کا　　جفا کی ہوگئی خو امتحاں سے

خدا کی بے نیازی ہائے مومنؔ
ہم ایماں لائے تھے نازِ بتاں سے

سرگرمیاں

بین الاقوامی غالب سمینار

معاصرین غالب و مومن

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام سالانہ بین الاقوامی غالب سمینار ۱۶، ۱۷، ۱۸ فروری ۱۹۸۵ء کو ایوان غالب میں منعقد ہوا۔ یہ سمینار مرزا کے معاصر حکیم مومن خاں مومن کے فن و شخصیت پر تھا۔

غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے غالب آڈیٹوریم میں ۱۶ فروری کو شام ۵ بجے ایک سادہ مگر پُر وقار تقریب میں جناب کے سی۔ پنت مرکزی وزیر تعلیم حکومتِ ہند نے اس بین الاقوامی سمینار کا افتتاح فرمایا۔ جس میں ایران اور مُلک کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے مندوبین کے علاوہ شہر کے عمائد، یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ اور طلبہ نے بڑی تعداد میں شرکت فرمائی۔

پروگرام کی ابتداء غالب اور مومن کی غزلوں سے ہوئی جنھیں مشہور گلوکار سردار صاحب سنگھ نے بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا۔

مہمان خصوصی کی گل پوشی کے بعد غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری جناب محمد شفیع قریشی نے سابق وزیر اعظم اور انسٹی ٹیوٹ کی سابق چیرمین اور بانی ٹرسٹی محترمہ اندرا گاندھی کی وفات پر ایک تعزیتی قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اندرا جی نے اس ادارے کی تشکیل اور اس کے قیام اور فروغ میں بیحد دلچسپی لی تھی۔ ان کی سرپرستی میں یہ ادارہ علم و ادب کے

میدان میں منزل بہ منزل آگے بڑھتا رہا۔ ان کے انتقال سے غالب انسٹی ٹیوٹ ایک ایسی سرپرست سے محروم ہوگیا جس کی رہنمائی اسے قدم قدم پر عزم وعمل کے نئے چراغ دکھاتی تھی۔ یہ جلسہ وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی اور دیگر پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور غم میں برابر کا شریک ہے۔

آخر میں حاضرین نے کھڑے ہوکر دو منٹ تک خاموشی اختیار کی۔

مہمان خصوصی جناب کے۔ سی۔ پنت نے غالب اور مومن کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے کلام کی تعریف کی جس نے حب الوطنی اور قومی یکجہتی کا جذبہ پیدا کیا انھوں نے غالب کے متعلق فرمایا کہ ان کا کلام پورے بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالب اور مومن دونوں اس دور کے شاعر تھے جب انگریزی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے ایک جنگ لڑی جارہی تھی۔ انھوں نے اس زمانے کی تنگ نظری کے خلاف بھی آواز اٹھائی اور انقلابی راہ دکھائی۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کی چیرمین بیگم عابدہ احمد نے اپنی استقبالیہ تقریر میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی اب تک کی کارکردگی اور اس کے پروگراموں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ کے آئندہ عزائم پر روشنی ڈالی۔ موصوفہ کی مکمل تقریر درج ذیل ہے:

محترمہ بیگم عابدہ احمد کی تقریر

غالب انسٹی ٹیوٹ کی چیرمین کی حیثیت سے میرا یہ خوش گوار فریضہ ہے کہ میں آج کے مہمان خصوصی شری کے۔ سی۔ پنت، وزیر تعلیم حکومتِ ہند کو خوش آمدید کہوں اور دنیا کے مختلف ملکوں سے اور ہندوستان کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے مفکروں اور دانشوروں کا استقبال کروں جو ہماری دعوت پر بین الاقوامی غالب سیمنار میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے ہیں اور جن کی موجودگی سے اس سیمنار کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔

خواتین وحضرات! بے محل نہ ہوگا اگر میں اس وقت غالب انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں چند لفظ کہنے کی جسارت کروں۔ اس ادارہ کی بنیاد ۱۹۶۸ء میں رکھی گئی تھی جب

دنیا بھر میں غالب صدی منانے کی تیاریاں شروع کی گئی تھیں۔ فخرالدین علی احمد مرحوم، اور آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے اس ادارے نے بیحد ترقی کی۔ غالب اور عہد غالب کی تفہیم اس کا بنیادی مقصد قرار پایا جس کے حصول کے لیے مختلف سمتوں میں کام شروع کیا گیا۔ ہم سب ڈرامہ گروپ، غالب میوزیم، فخرالدین علی احمد ریسرچ لائبریری اس ادارے کے مختلف شعبے ہیں۔ ہم نے غالب اور عہد غالب کے متعلق کئی اہم کتابیں شائع کی ہیں جن میں غالب کے خطوط اور دیوناگری رسم الخط میں دیوانِ غالب بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ششماہی مجلہ "غالب نامہ" شائع کیا جاتا ہے جو اہم تحقیقی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔ فخرالدین علی احمد میموریل لکچرز، ماہانہ ادبی جلسوں اور دیگر سرگرمیوں کے علاوہ غالب ایوارڈ اس ادارے کی پہچان بن گئے ہیں۔ علم و ادب کے مختلف شعبوں میں اہل قلم کی تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتوں کا اعتراف ہر سال غالب ایوارڈ دے کر کیا جاتا ہے۔ گذشتہ سال شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھوں اُردو اور فارسی کے سات دانشوروں کو غالب ایوارڈ دیے گئے۔

بین الاقوامی غالب سمینار اس ادارے کی بیحد اہم سرگرمیوں میں سے ہیں۔ آج ساتویں سمینار کا افتتاح عمل میں آرہا ہے۔ یہ سمینار علمی دُنیا اور غالب شناسی کے میدان میں نئے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی اس سمینار میں دُنیا کے کئی ممالک کی نمائندگی ہے۔ غالب شناسی کے لیے ضروری ہے کہ عہد غالب کا بھرپور مطالعہ کیا جائے اور اس کے لیے نہ صرف غالب بلکہ غالب کے ہم عصر شعرا کا مطالعہ بھی ضروری ہے، چنانچہ اس سمینار کا موضوع ہے معاصرین غالب ــــــ اور خاص طور پر حکیم مومن خاں مومن کی زندگی اور فکر و فن پر مقالے پڑھے جائیں گے اور مجھے یقین ہے کہ یہ سمینار مومن کی شخصیت کے مختلف گوشے اجاگر کرے گا جو ایک منفرد شاعر، حکیم اور نجومی تھے۔

مجھے خوشی ہے کہ اس بین الاقوامی سمینار کا افتتاح ہمارے بلند حوصلہ وزیر تعلیم شری کے۔ سی پنت فرما رہے ہیں اور اس موقع پر ان کا استقبال کرتے ہوئے میں فخر محسوس کر رہی ہوں کیونکہ پنت جی کو اُردو زبان و ادب سے دلچسپی ہے اور وہ اس مشترکہ تمدن اور گنگا جمنی تہذیب کے پروردہ ہیں جس سے اُردو زبان کا خمیر تیار ہوا ہے۔

شریمتی اندرا گاندھی نے اُردو کو جاندار اور شاندار زبان کہا تھا وہ اس زبان کے مسائل کو بہ خوبی محسوس کرتی تھیں۔ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی بانی ٹرسٹی تھیں اور چیرمین رہ چکی تھیں، اس ادارے کی تشکیل تعمیر ــــــ اور فروغ میں ہمیں قدم قدم پران کی رہنمائی حاصل رہی۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں نگران کی مشعل ہمارے نوجوان رہنما وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کے ہاتھوں میں ہے جن سے ملک کو بڑی امیدیں ہیں۔ اور آپ جیسے روشن دماغ کے ہاتھ میں وزارتِ تعلیم کی باگ دوڑ ہے ــــــ پنت جی! مجھے کہنے دیجیے کہ آپ کے سر بہت بڑی ذمہ داری ہے۔

تعلیم وہ روشنی ہے جو ملک و قوم کے دلوں میں اُجالا بکھیرتی ہے علم و تعمیر پر ملک کے حال کا ہی نہیں ــــــ مستقبل کا بھی دارو مدار ہے۔ کیونکہ آج جو بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں کل وہی ملک کی باگ دوڑ سنبھالیں گے۔ اب اگر انھیں ناقص تعلیم ملے گی تو وہ ناکارہ ثابت ہوں گے اور ملک کی کشتی ڈگمگانے لگے گی ــــــ ہم آج تاریخ کے ایک اہم موڑ پر ہیں۔ پرانی نسل تقریبًا اپنا کام پورا کرکے تاریخ کا حصہ بنتی جا رہی ہے اور نئی نسل نئی توانائی، نئے حوصلے اور نئے اداروں کے ساتھ میدانِ عمل میں نکل آئی ہے۔ آج ہمیں اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لینا ہے، اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا ہے، آج ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا ہمارا موجودہ تعلیمی نظام وقت کے تقاضوں کے مطابق ہے ــــــ شاید نہیں ــــــ اس معاملے میں ہم آج بھی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں اور قدامت کے اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں، لیکن وقت کا تقاضہ کچھ اور ہے

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

اُردو زبان کو ہی لیجیے ــــــ کیا ہمارے جیسے جمہوری اور سیکولر ملک میں عوام کو یہ حق نہیں کہ ان کے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم ملے ــــــ اور ایسی تعلیم ملے جس کے بل پر آگے چل کر وہ اپنا پیٹ بھر سکیں۔ اور اس زبان کے جاننے والوں کو سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں خاطر خواہ کام مل سکیں کیونکہ زبان کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ اس کا رشتہ معاش سے جڑا

ہوا ہو کوئی زبان شوقیہ اسی وقت سیکھی جا سکتی ہے جب پیٹ بھرا ہو ۔۔۔ یہ مشاعرے، یہ غزل اور قوالی کی محفلیں بیشک اُردو کی مقبولیت ظاہر کرتے ہیں لیکن اُردو محض مشاعرے برپا کرنے اور غزلوں اور قوالیوں کی محفل سجانے سے زندہ نہیں رہ سکتی ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے سرکاری اور نیم سرکاری ادارے اُردو کی تعلیم، بقا اور ترقی کے لیے ٹھوس کام کریں اور تعلیمی نظام میں ایسی تبدیلیاں لائی جائیں کہ اُردو کا چلن ہو اور یہ شگفتہ، شیریں اور سیکولر زبان ۔۔۔ لسانی تعصب کا شکار ہو کر نہ رہ جائے ۔

پنت جی! ہمیں آپ کی ذات سے قوی امید ہے کہ آپ اس اہم قومی مسئلے کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں گے اور اردو کی، ترقی کے لیے خاطر خواہ ماحول پیدا کریں گے کیونکہ اردو کی بقا اس ملک کے جمہوری طرزِ زندگی کی بقا ہے سیکولرزم کے لیے اردو آب حیات سے کم نہیں جو غیر سرکاری ادارے اپنے محدود مسائل کے باوجود اردو کے فروغ کے لیے مخلصانہ کام کر رہے ہیں ان کی ہمت افزائی محض اردو کی ہی خدمت نہیں، ملک وقوم کی بھی خدمت ہے ۔ اور میں محسوس کرتی ہوں کہ یہی جذبہ ہے جو آپ کو گوناگوں مصروفیات کے باوجود یہاں لایا ہے ۔

میں پھر قلب کی گہرائیوں سے آپ کا استقبال کرتی ہوں اور سمینار میں حصہ لینے والے بیرونی اور مقامی دانشوروں کا خیر مقدم کرتی ہوں ۔

جناب پروفیسر نذیر احمد، چیرمین سمینار سب کمیٹی کی تقریر

عزت مآب کے ۔ سی پنت صاحب، محترمہ بیگم عابدہ احمد صاحبہ، مندوبین گرامی، خواتین حضرات! غالب انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ غالب شناسی کی روایت مستحکم اصولوں پر قائم کی جائے اور ملک اور بیرون ملک کے دانشوروں کے تعاون سے اس روایت کو اس طرح آگے لے جائے کہ یہ نئی نسلوں کے لیے ایک مثال ہو۔ غالب ریسرچ لائبریری کا قیام، غالب نامے کا اجرا، غالب سے متعلق کتابوں کی نشرو اشاعت اسی مقصد کے حصول کی کڑیاں ہیں۔ ان علاوہ اسی مقصد کے تحت انسٹی غالب اور عہد غالب

کے موضوع پر ہر سال ایک انٹرنیشنل سمینار کا انعقاد کرتا ہے جس میں ہندوستان کے علاوہ پاکستان،
ایران، افغانستان، روس، بنگلہ دیش وغیرہ ممالک کے دانشور شریک ہوتے ہیں، اس طرح یہ
سمینار بین الاقوامی علمی روابط کی ایک کڑی کا کام کرتا ہے۔ اب تک پانچ سمینار ہو چکے ہیں
جن میں غالب اور عہد غالب سے متعلق کم وبیش سو موضوع پر اعلیٰ درجے کے مقالے پیش
کیے جا چکے ہیں اور جن میں اکثر انسٹی ٹیوٹ کے مجلے غالب نامہ میں شائع ہو چکے ہیں امسال
موضوع میں تنوع کی غرض سے غالب کے ممتاز ترین معاصر شاعر حکیم مومن کو سمینار کا موضوع
قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ غالب پر کام کرنے کی گنجائش کافی نہیں
رہی دراصل غالب اردو کا وہ شاعر ہے جو محض شاعر ہی نہ تھا، بلکہ مورخ، محقق اور نقاد اور دانشور سب
کچھ تھا۔ اس نے زبان وادب، تاریخ وتہذیب کے موضوعات پر اتنا مواد فراہم کر دیا ہے کہ
اس سے اردو کا ان سائیکلو پیڈیا تیار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ پہلے مشہور محقق قاضی عبدالودود
صاحب نے "جہان غالب" کے نام سے اس کی ابتدا بھی کر دی تھی اور جن لوگوں نے قاضی صاحب
کے مضامین دیکھے ہیں وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ ابھی غالب پر سالہا سال کام کرنے
کا موقع ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے غالب ان سائیکلو پیڈیا کی تیاری کا ایک خاکہ بنایا تھا
لیکن بعض موانع کی وجہ سے یہ کام تعویق میں پڑ گیا۔ جیسے ہی حالات سازگار ہوئے یہ اہم
کام شروع ہو جائے گا۔ غالب فارسی کے نہایت سربرآوردہ شاعر تھے اور ان کی شاعری
ایران کے بڑے بڑے اساتذہ سخن کے ہم پلہ تھی، بلکہ دور متاخر کے بعض ممتاز شعرا سے
ان کا پلہ بھاری نظر آتا ہے، عرفی، نظیری، ظہوری طالب، صائب، کلیم میں کسی کو غالب پر
ترجیح حاصل نہیں، اور مولانا حالی کی یہ رائے بڑی حد تک صحیح ہے کہ لٹریری قابلیت
کے لحاظ سے مرزا جیسا جامع حیثیات آدمی امیر خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی
خاک سے نہیں اٹھا۔ فارسی کے ایسے باکمال شاعر وانشا پرداز کی صلاحیت کے جانچنے اور
پرکھنے کے سلسلے میں اب تک موثر اقدام نہیں ہوا، اور ستم یہ ہے کہ ہنوز ان کی کلیات نظم ونثر
کی تصحیح وترتیب انتقاد متن کے جدید اصولوں پر نہیں ہو سکی ہے۔ اسی طرح دوسرے علوم
میں غالب کی دستگاہ تحقیق کا دلچسپ موضوع ہے جو بڑی حد تک تشنہ ہی ہے۔ مرزا کی

ایران شناسی اور فارسی فرہنگ نگاری دانشوروں کو دعوتِ مطالعہ و تحقیق دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ تحقیق کے اعتبار سے ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے۔ دراصل غالب کی علمی و فنی بصیرت پر جیسا کام انجام پذیر ہونا چاہیے نہیں ہوا جس کی منجملہ اور وجوہ کے ایک بڑی یہ کہ سارا مواد فارسی میں ہے۔ اور فارسی کا چلن روز بروز کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے بجا طور پر خدشہ ہو چلا ہے کہ ایسا نہ ہو یہ سارا سرمایہ اچھوتا ہی رہ جائے۔ غالب کی صحیح تفہیم کے لیے اس طرح کی تحقیق لازمی عمل ہے، اس طرح مطالعہ سے ایک طرف تو وہ صحیح طور پر پرکھے جا سکیں گے۔ اور دوسری طرف ان کی بین الاقوامی حیثیت مسلّم ہو سکے گی اور دانشوری کی اس بلند روایت کا اعتراف ہندوستان اور بیرونِ ہند کے علما اور فضلا کی طرف سے ہوگا کارِ مغاں ابھی اختتام کو نہیں پہنچا ہنوز "رگِ تاک سے بزہ بادۂ ناخوردہ" کی کشید باقی ہے۔

اس سال کے سمینار کا موضوع مومن خاں ہے، مومن خاں غالب کے معاصروں میں بڑی امتیاز کے مالک تھے، اگرچہ اس موضوع کے وجہ انتخاب میں معاصرت کے علاوہ کوئی اور بڑی وجہ نہ تھی لیکن یہ اتفاق دیکھیے کہ مومن کی آخری منزل اسی انسٹی ٹیوٹ کے بغل میں ہے، مہندیوں کے قبرستان میں جہاں شاہ ولی اللہ کا خاندان ابدی نیند سو رہا ہے مومن بھی وہیں آرام فرما ہیں، دوسرا اتفاق یہ کہ غالب نے مومن کے ایک شعر کے تعلق سے کبھی کبھی اتنا مہنگا سودا نہیں کیا تھا۔ یہ واقعہ تو بھی جانتے ہیں کہ مرزا مومن کے اس شعر کے مقابلے میں اپنا پورا دیوان داؤں پر لگا رہے تھے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالی نے لکھا ہے کہ مرزا نے مومن خاں کا جب یہ شعر سنا "تم مرے پاس" تو اس کی بہت تعریف کی اور یہ کہا "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دے دیتا۔

مومن کی شاعری پر بحث تو سمینار میں ہوگی یہاں یہ اشارا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے اپنے تخلص سے فائدہ اٹھا کر اپنے اشعار میں نہایت لطیف نکتے پیدا کیے اور اسی وجہ سے وہ ضرب المثل کے درجے میں ہیں، جیسے یہ شعر:

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن　　آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

یا جیسے یہ شعر:

اللہ رے گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر　　مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

غالب کے معاصرین میں مومن بعض لحاظ سے نہایت ممتاز تھے، مثلاً وہ اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی کے بڑے درجے کے شاعر و انشا پرداز تھے۔ ان کی انفرادیت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ ان کا کلام نظم و نثر اس دور کی سیاسی و تہذیبی و دینی واقعات کا عکاس ہے، وہ حساس دل رکھتے تھے، سچے وطن پرست تھے انگریزوں کی چیرہ دستی اور جبر و تشدد کے واقعات سے سخت نالاں تھے، سید احمد شہید کی تحریک کے حامی تھے اور اپنے کلام میں اس پر اظہار خیال بھی کیا ہے۔ مومن کی شخصیت کا یہ روشن پہلو بحث و تحیص کا نہایت اہم موضوع ہے۔

مومن کے فضلیت کا بڑا نشان ان کے علوم نجوم میں مہارت ہے انھوں نے اس سے اپنی شاعری کو بڑی توانائی بخشی ہے، مثلاً یہ شعر:

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس　　آسمان بھی ہے ستم ایجاد کیا

محض شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ اس کی بنیاد خود شاعر کے ذاتی تجربے و علم پر ہے، یا یہ شعر بھی کچھ اسی درجے کے ہیں۔

تا طالع و کوکبم چہ باشد　　روزم ہمہ شب شبم چہ باشد

سیارہ شناسم و ندانم　　تا طالع و کوکبم چہ باشد

مرزا فرحت اللہ بیگ کی کتاب! دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ کا یہ اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں ——

ریختے کے استاد کا کلام سننے کو سب ہمہ تن گوش ہو گئے، انھوں نے شمع کو اٹھا کر ذرا آگے رکھا سنبھل کر بیٹھے، بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی، ٹوپی کو کچھ ترچھا کیا، آستینوں کی چنٹ کو صاف کیا درد انگیز آواز میں دل پذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی!

الٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ　　بے طاقتی کے طعنے ہیں عذر جفا کے ساتھ

بہر عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ　　دم ہی نکل گیا مرا آواز پا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ہے کس کا انتظار کہ خواب عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آواز پا کے ساتھ

سو زندگی نثار کریں ایسی موت پر
یوں روئے زار زار تو اہل عزا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

اس کی گلی کہاں کہ یہ تو باغ خلد ہے
کس جائے مجھکو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

اللہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی جادو تھا تمام لوگ ایک عالم محویت میں بیٹھے تھے وہ خود بھی اپنے کلام کا مزہ لے رہے تھے۔ جس شعر پر ان کو زیادہ لطف آتا تھا اس کے پڑھتے وقت ان کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں، بہت جوش ہوا تو کاکلوں کو انگلیوں میں بل دے کر موڑنے لگے۔ کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر مسکرا دئے۔ پڑھنے کا طرز بھی سب سے جدا تھا۔ ہاتھ بہت ہلاتے تھے اور ہلاتے بھی کیسے بالوں سے کب فرصت تھی، ہاں آواز کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کر جاتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعرا نے تعریف کی۔ سن کر مسکرائے اور کہا: آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری محنت کا صلہ ہے۔ میں تو عرض کر چکا ہوں:

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالب زر کچھ
تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

آخر میں ہم سب مندوبین کو خوش آمدید کہتے ہیں، اور حاضرین کرام کا شکریہ ادا کرتے ہیں جن کی زحمت فرمائی جلسے کی کامیابی کی ضامن ہوئی۔

سمینار کے اجلاس

سمینار کا پہلا اجلاس ۷ افروری کو صبح دس بجے زیر صدارت مالک رام صاحب منعقد ہوا جس کی نظامت جناب رفعت سروش نے کی۔ ڈاکٹر خلیق انجم دہلی نے اپنا مقالہ مومن کا سوانحی خاکہ پیش کیا جو مومن کی مثنویوں، بیانوں اور خطوط کی روشنی میں مرتب کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر کامل قریشی

(دہلی) اور پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے مقالے کی تعریف کی۔

اس اجلاس کا دوسرا مقالہ "مومن اور ان کے نقاد" ڈاکٹر تنویر علوی نے پیش کیا۔ اس مقالہ میں خصوصی ذکر حکیم قطب الدین باطن کا ہے جو مومن کا زبردست مخالف تھا۔ شیفتہ نے (جو مومن کے شاگرد تھے اور ان کی موت کے بعد غالب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے) مومن اور اُمۃ الفاطمہ عرف صاحب جی کے معاشقے کی داستان کیا لکھی مومن کے مخالفین کو ترپ کا پتہ ہاتھ آگیا۔ مقالے میں کہا گیا ہے کہ مومن کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت پسندی نے بھی انہیں نقصان پہنچایا۔ سعدی شیرازی کی مقبول عام تصنیف "گلستاں" کے بارے میں مومن کہتے تھے کہ اس میں گفت، گفتہ است اور گفتہ اند کے علاوہ اور ہے کیا۔ مومن کے مخالفین نے اسے خوب اچھالا اور مومن کی اہانت کے سامان تیار کئے۔

دوسرے اجلاس کی صدارت ایران کے مشہور محقق اور ادیب علی اکبر جبدری سیرجانی نے فرمائی۔ محترم سیرجانی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی نئی تصنیف "درآستین مرقع" حال ہی میں منظرِ عام پر آئی ہے جو ان کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس اجلاس کی نظامت پروفیسر نور الحسن کے سپرد تھی اور ڈاکٹر اسمٰعیل حاکمی (ایران) نے مومن کے فن و شخصیت سے متعلق فارسی میں لکھا اپنا مقالہ پیش کیا جس پر کوئی بحث نہیں ہو سکی۔

دوسرا مقالہ "مومن کا اثر ان کے تلامذہ پر" پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے پیش کیا۔ اس مقالے میں مومن کو دلی اور لکھنؤ کی ادبی روایات کا سنگم بتاتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ان کے شاگردوں نے بھی یہ روایت قائم رکھی لیکن تصوف کے معاملہ میں مومن اور ان کے شاگردوں میں فرق ہے مومن تصوف سے بے تعلق رہے لیکن ان کے شاگردوں نے اسے گلے لگایا۔

جناب یونس سلیم، ڈاکٹر وہاب اشرفی اور ڈاکٹر خلیق انجم نے مقالے کی تعریف کی۔ لیکن یہ نکتہ اٹھایا کہ مومن غزلوں کی دنیا میں محدود رہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مقالہ نگار نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو غالب انہیں زندہ نہیں رہنے دیتے۔ یہ مومن کی بدنصیبی ہے کہ ان کے سامنے غالب جیسا پہاڑ کھڑا ہو گیا۔ فانی، حسرت موہانی اور ان کے معاصرین کی یہ بدنصیبی ہے کہ ان کے سامنے اقبال جیسا پہاڑ آگیا۔

اس اجلاس میں پروفیسر علوی مقدم مشہد یونیورسٹی ایران نے غالب پر مبنی اپنا فارسی مقالہ بغیر پڑھے اس استدعا کے ساتھ صدر جلسہ حوالے کر دیا کہ اس کا اردو ترجمہ غالب نامہ میں شامل کر لیا جائے۔

تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر سید امیر حسن عابدی نے فرمائی اور نظامت کا فرض ڈاکٹر کامل قریشی نے انجام دیا۔ اس اجلاس میں "اردو اور فارسی کی دو منفرد آوازیں" کے عنوان سے ڈاکٹر رضیہ اکبر (حیدر آباد) نے اپنا مقالہ پیش کیا جس میں غالب اور مومن دونوں کو اپنا پسندیدہ شاعر بتاتے ہوئے کہا ہے کہ یہ دونوں ہم عصر شعرا ایک دوسرے کی تکمیل ہیں اس کے باوجود محترمہ نے لکھا ہے کہ ایک طرح کا سماجی ماحول اور ایک طرح کی تہذیبی اور ثقافتی روایت ہوتے ہوئے بھی دونوں کے مزاج، ذہنی افتاد اور انداز فکر میں نمایاں فرق ہے۔

اسی اجلاس میں پروفیسر حکم چند نیر (بنارس) کے پیش کردہ مقالہ "مومن کی شخصیت کے تضادات" پر کافی گرما گرم بحث ہوئی۔ مقالہ نگار نے کہا ہے کہ مومن کے بارے میں غیر متعلق باتیں زیادہ اور کام کی باتیں کم لکھی گئی ہیں۔ مقالہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ ——— "جینس" کسے کہا جاتا ہے اور اس میں کیا خصوصیت ہونا چاہیئے مقالہ نگار نے اس پر کافی روشنی ڈالی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ کسی شاعر کے فن و شخصیت کو سمجھنے کے لیے تحلیل نفسی سے بھی کام لینا چاہیے۔

بحث میں حصہ لیتے ہوئے ڈاکٹر شارب ردولوی نے کہا کہ تحلیل نفسی سے ادیب کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ البتہ فنکار کی ذات کو کسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔ جناب یونس سلیم نے مومن کو بڑا شاعر نہ ماننے یا لکھنے پر اعتراض کیا۔ ڈاکٹر وارث کرمانی کا کہنا تھا کہ ایک شاعر اگر مذہبی بھی ہو اور عشق بھی کرے تو یہ تضاد نہیں ہے۔ مومن پریکٹیکل قسم کے عاشق تھے اور غالب روایتی عاشق۔ غالب کی عشقیہ شاعری کو مومن عملی جامہ پہناتے تھے۔ پروفیسر وارث کرمانی کے اس دلچسپ اظہار خیال پر محفل قہقہہ زار بن گئی۔ مقالہ نگار پروفیسر حکم چند نیر نے مقالے پر کئے گئے اعتراضات کے فرداً فرداً جوابات دیئے۔ ڈاکٹر کامل نے مقالے پر ہوئی

بحث کو مقالے کی کامیابی کی دلیل بتایا۔

چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ اور نظامت ڈاکٹر کامل قریشی نے فرمائی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر صلاح الدین (دہلی) نے "شیفتہ اور مومن" کے عنوان سے ایک دلچسپ اور صاف ستھرا مقالہ پیش کیا جو لفظی کاریگری اور اُلجھاؤ سے پاک تھا۔ مقالے میں کہا گیا ہے کہ غالب اور مومن نے جب میدانِ ادب میں قدم رکھا اس وقت دہلی میں شاہ نصیر اور لکھنؤ میں ناسخ کے اثرات تیزی سے پھیلتے جا رہے تھے۔ شاعروں کا نوجوان طبقہ شاہ نصیر اور ناسخ سے متاثر ہو رہا تھا۔ یہ صورتِ حال نئی اور پرانی قدروں کے ٹکراؤ کا نتیجہ تھی۔ شیفتہ کے دور میں یہ تصادم بہت نمایاں ہو گیا۔ کچھ شعرا تذبذب کا شکار تھے اور کچھ روایت پرستی اور بغاوت کے درمیان کی راہ پر چلنے کے لیے اپنے ذہن کو ہموار کرتے تھے۔ شیفتہ کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے روایت و انقلاب کے بیچ کی راہ اپنائی۔ شیفتہ کے مندرجہ ذیل اشعار ان کے اس ذہنی انقلاب کی نشان دہی کرتے ہیں :

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

مقالے میں کہا گیا ہے کہ شیفتہ کی شاعری ایک ایسا آئینہ بن گئی ہے جس میں اُس دور کے تمام بڑے شعرا کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ شیفتہ ایک سخن فہم شاعر تھے ان کی سخن فہمی کا اعتراف غالب کو بھی تھا۔ ڈاکٹر صلاح الدین کے مقالے کی تان یہاں ٹوٹی کہ ان کے پہلے اُستاد مومن نے چھ عشق کیے اور ڈٹے رہے لیکن میاں شیفتہ نے صرف ایک عشق کیا اور چیں بول گئے۔ اس کامیاب مقالے پر ڈاکٹر صلاح الدین کو سامعین نے مبارکباد دی۔

اس اجلاس کا دوسرا مقالہ "مومن کی غزل گوئی" کے عنوان سے ڈاکٹر وہاب اشرفی (رانچی) نے پیش کیا۔ مقالے میں مومن کی نازک خیالی اور معنی آفرینی پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور

یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ مومن کا تغزل محدود ہے ، اس میں تنوع اور خیالات کی ہمواری کا فقدان ہے ۔ مقالہ بہت متوازن تھا اور موضوع کے مطابق اور اس کی حد میں تھا ۔

۱۸ فروری کو پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر وہاب اشرفی نے فرمائی۔ ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نے نظامت کا بار سنبھالا۔ آج کا پہلا مقالہ ڈاکٹر اسلم پرویز (دہلی) نے "غالب اور مومن" کے عنوان سے پیش کیا۔ ڈاکٹر موصوف کے مطابق مومن عشقیہ شاعری میں ممتاز تو نہیں لیکن ان کا عشق صحت مند اور بوالہوسی سے بالاتر ہے عشق کی حدود میں مومن نے خوبصورت شاعری کی ہے لیکن اس محدود شاعری کی بنا پر انہیں "ادھورا شاعر" کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ مقالہ نگار نے غالب اور مومن کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ غالب ایک بڑے شاعر تھے اور مومن ایک اچھے شاعر، ڈاکٹر اسلم پرویز کے اس مقالے پر کھل کر بحث ہوئی۔ ڈاکٹر تنویر علوی نے مقالہ نگار کو اس کے اچھے مقالے پر داد دی اور کہا کہ غالب نے غزل کو تہذیب عاشقی بنایا اور مومن نے اسے اس وقت کے دائرے میں رکھا اور کوچۂ محبوب میں سر کے بل گئے ۔ جناب رشید حسن خاں نے مقالہ نگار کو اپنے موضوع کی حد میں خانہ فرسائی کرنے کے لیے داد دی جو آج کل مفقود ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی نے کہا کہ مقالہ نگار نے بڑی محنت اور کدوکاوش سے مقالہ تیار کیا ہے ۔ غالب کا ذہن آفاقی تھا اور اس میں زبردست تخلیقی توانائی تھی ۔ غالب کے یہاں جنسیات، تخلیقی عمل، مشاہدات اور الفاظ کی جو شخصیت اور عمل ہے وہ مومن کے یہاں نہیں، ڈاکٹر انور صدیقی نے کہا کہ موازنہ شعری تخلیقات پر ہونا چاہیے نہ کہ ذات پر۔ بہرکیف غالب کے یہاں شعری کائنات ہے اور مومن کے یہاں شعری دُنیا ، جناب یونس سلیم نے رائے دی کہ غالب ایک روایتی عاشق اور مومن ایک عشق پیشہ شاعر تھے ۔ موازنہ میں اس کا خیال رکھنا ضروری ہے بہرکیف ڈاکٹر اسلم کے مقالے پر بولنے والوں کی اکثریت اس بات پر متفق نظر آئی کہ غالب ایک آفاقی شاعر تھا اور مومن کی دُنیا محدود تھی ۔

اس اجلاس کا دوسرا مقالہ ڈاکٹر عبدالودود اظہر نے بعنوان "مومن کے مذہبی عقائد" پیش کرتے ہوئے مومن کو اہلِ حدیث مسلک کا پیرو بتایا یہ مقالہ مناظرہ کی صورت اختیار کر گیا ۔

بہر کیف سامعین کی مداخلت پر بات بڑھی نہیں اور ماحول خوشگوار ہو گیا۔

آج کے دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر حکم چند نیّر اور نظامت ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی کو تفویض ہوئی۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ "انشائے مومن پر ایک نظر" پیش کیا گیا جس کے تخلیق کار جناب کبیر احمد جائسی نے مومن کی نثری تخلیقات جن میں ان کے خطوط اور علم نجوم پر مبنی بعض اہم پیش گوئیاں شامل ہیں ان کا بہت عمدہ جائزہ پیش کیا ہے۔ انشائے مومن کے مرتب پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے اس مقالے کی بہت تعریف کی۔

دوسرا مقالہ جناب رشید حسن خاں نے پیش کیا موضوع تھا "مومن کی پیچیدہ بیانی" موصوف نے اپنے مقالے میں کہا ہے کہ مومن کے کلام کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک حصے میں وہ کلام شامل کیا جائے جو سلیس، سادہ اور عام فہم ہے، دوسرے حصے میں اس کلام کو جگہ دی جائے جس میں پیچیدگی ہے اور یہ پیچیدگی معنی آفرینی کی ایک کڑی ہے جس کے پانچ ناسخ ہیں، مومن کی پیچیدگی لفاظی میں پوشیدہ ہے اس میں کوئی گہرائی نہیں مقالہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ غالب، خیال بند شعراء بیدل، عرفی، اور نظیری سے متاثر نظر آتے ہیں۔ غالب کے یہاں الفاظ کا خلاقانہ استعمال فلسفیانہ انداز اور تہ داری ہے جو مومن کے یہاں نہیں ملتی، مومن کی پیچیدگی اور معنی آفرینی نے ان کے کلام کے بہت بڑے حصے کو بے روح اور بے رنگ بنا دیا ہے۔ مومن کا وہی کلام مقبول ہوا جو مذکورہ بالا عیب سے پاک ہے جس میں حسن و عشق کے تذکرے، رقیب کے شکوے اور محبوب کے ناز و انداز کی باتیں ہیں خان صاحب اپنے مقالے میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مومن بلا شبہ ایک اچھے شاعر تھے لیکن ان کا نام غالب اور صہبائی کے بعد ہی لیا جائے گا۔

مذکورہ بالا مقالہ کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ اس سے پہلے انہیں پیچیدگی معنی آفرینی اور بکر شاعرانہ کا باہمی فرق معلوم نہیں تھا۔

اس سیمنار کا آخری اجلاس کامریڈ شولوخوف، ڈائرکٹر اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ ماسکو کی صدارت میں شروع ہوا۔ صدر محترم آج کل دہلی میں مقیم ہیں اور جدید اردو ادب پر تحقیقی کام کی رہنمائی فرما رہے ہیں اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر اسلم پرویز کے ذمہ تھی۔ اس اجلاس میں تین مقالے

پیش کیے گئے۔

(۱) مومن کے نقاد ۔ ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی ۔ (۲) مومن کی پیکر تراشی ۔ ڈاکٹر عنوان چشتی ۔ (۳) مومن غزل کے ایک نئے آہنگ کا شاعر ۔ ڈاکٹر کامل قریشی ۔ تینوں مقالہ نگار تحقیق و تنقید کی دنیا میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور کسی تعارف کے محتاج نہیں تینوں مقالے بڑی ذمہ داری اور عرق ریزی سے تیار کیے گئے ہیں سامعین نے انہیں بڑی توجہ سے سنا لیکن ان پر خاطر خواہ بحث نہیں ہو سکی باہر سے آئے ہوئے مندوبین کو رخصت کرنا بھی تھا جس کے لیے وقت بہت کم رہ گیا تھا ۔ لہٰذا صدر جلسہ کا مرید شو رخت کے صدارتی تقریر کے بعد غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری جناب محمد شفیع قریشی کے اظہارِ تشکر کے بعد یہ سہ روزہ سمینار بحسن و خوبی انجام پذیر ہوا۔

غالب کے خطوط

مورخہ ۲۷ اپریل ۸۵ء شام کے ساڑھے پانچ بجے غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ماہانہ ادبی جلسہ منعقد ہوا جس میں غالب کے خطوط (مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم) پر ایک بھرپور مقالہ ڈاکٹر کامل قریشی صاحب نے پیش کیا ۔ اس جلسے کی صدارت مشہور ماہر تعلیم اور دہلی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب سروپ سنگھ صاحب نے فرمائی ۔

پروگرام کی ابتدا میں دہلی گھرانہ کے معروف استاد اقبال احمد خاں نے اپنی مسحور کن آواز میں غالب کی مشہور کن غزل

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

سنا کر حاضرین جلسہ کی داد و تحسین حاصل کی ۔ کلام غالب کے بعد ڈاکٹر کامل قریشی نے چیرمین غالب انسٹی ٹیوٹ ، سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ و ڈائرکٹر رفعت سروش صاحب کو مبارکباد پیش کی کہ انھوں نے اس قسم کی ادبی نشست کی ایک نئی روایت قائم کی ہے ۔ ڈاکٹر کامل قریشی نے اپنے مقالہ میں کہا کہ پہلی بار غالب کے خطوط پر نہایت عالمانہ کام پیش کیا گیا ہے اور نہایت

فاضلانہ انداز سے خطوط غالب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے تنقیدی حصہ کو باغ و بہار بنانے کی جو کوشش کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انھوں نے بہت سے عنوانات قائم کئے ہیں مثلاً غالب کا ہے انداز بیاں اور' پر عنوان کے ساتھ مرتب نے جو پیرایہ بیان کیا ہے وہ ان کی خوش سلیقگی کا مظہر ہے۔ مقالہ نگار نے کہا کہ مصنف کی یہ پہلی کتاب ہے جس کی بیحد پذیرائی ہوئی ہے۔ مختلف زبانوں کے اخبارات، ریڈیو سے اس کے بارے میں نشر و اشاعت ہوئی۔ ان کو بنگال اکیڈمی کی طرف سے انعام ملا یہ کتاب انسکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالب پرستوں کے لیے خلیق انجم کی یہ کتاب خاصے کی چیز ہو گی۔ آخر میں مقالہ نگار نے غالب انسٹی ٹیوٹ کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ یہی وہ ادارہ ہے جو یہ جوئے شیر لانے کا کام کر سکا اور نہایت حسن و خوبی سے شائع کیا۔

جناب صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ خلیق انجم نے جس لگن و محنت سے کام کیا ہے اس کا علم شاید کسی کو ہو میں نے ان کو روز کام کرتے دیکھا ہے انھوں نے مصائب و آرام کے زمانہ میں بھی بڑی تندہی سے کام کیا۔ اس کتاب کی اہمیت کے اعتبار سے بھی اُردو میں اتنا کچھ کام ہوا ہے لیکن اس کی ترتیب و تدوین کا کام ناکافی اور غیر منظم ہے اس کو چند طالب علم ہی استعمال کر سکتے ہیں پوری اُردو دُنیا اس سے مستفید نہیں ہو سکتی۔ اُردو مخطوطات بکھرے ہوئے ہیں اور لوگوں نے ان کو مرتب کرنے کی طرف توجہ نہ کی اس اعتبار سے خلیق انجم لائقِ تحسین ہیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے سیکریٹری و ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ کا دلی شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ زندگی میں یہ پہلا موقع ہے جب اس طرح میرے اور میری کتاب کے بارے میں کچھ کہا گیا۔ اس ادارے نے میری اس کتاب کے شائع ہونے میں میری قدم قدم پر مدد فرمائی اگر غالب انسٹی ٹیوٹ مدد نہ کرتا تو میری یہ کتاب شائع نہ ہو پاتی کامل قریشی میرے دیرینہ دوست ہیں انھوں نے بیحد معقول طریقہ کار اختیار کیا میں ان کا شکر گذار ہوں و سارے تبصرہ نگاروں کا شکر گذار ہوں غالب کے خطوط کا کوئی ایڈیشن اچھا یا بُرا نہیں ملتا تھا اب پہلی بار چونکہ یہ منظر عام پر آیا ہے اس سے اس کی پذیرائی ہوئی۔ غالب کی شاعری۔ میرے احساس کا حصہ نہ بن سکی ہاں خطوط غالب میری شخصیت کا حصہ بن گئے ہیں۔

آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر سروپ سنگھ کو زحمت دی گئی انھوں نے اپنی دلچسپ تقریر میں کہا جب تک ایک زبان بول چال کی زبان نہ رہے تو وہ پنپ نہیں سکتی یہ بات اُردو والوں کو سمجھنی چاہیئے۔ آہستہ آہستہ اُردو زبان کتابی زبان بنتی جا رہی ہے جو کہ بڑی خطرناک بات ہے۔ زبان کے لیے ساری کھڑکیاں کھلی رہنی چاہئیں جہاں سے بھی ہوا آتی ہے آنے دو اس سے زبان مستحکم و مقبول ہو گی۔ انھوں نے ڈاکٹر خلیق انجم کی زیر بحث کتاب اور ان کے کام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ خلیق انجم کی جب بھی کوئی ترقی ہوتی ہے یا انعام سے نوازا جاتا ہے تو مجھے بیحد خوشی ہوتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ انعام سے نام نہیں چلتا بلکہ کام انسان کو زندہ جاوید بناتا ہے۔

آخر میں ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ جناب رفعت سروش نے صدر جلسہ، مقالہ نگار و جملہ حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

انٹر یونیورسٹی تقریری مُقابلہ

غالب انسٹی ٹیوٹ ملک کا ایک ایسا ادارہ ہے جو علمی ادبی اور دیگر صحافتی میدانوں میں اُردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور تحقیق کے لیے پندرہ سولہ سال سے سرگرم عمل ہے۔ اس کے زیر اہتمام ۷ ارمارچ ۱۹۸۵ء کو صبح ایوان غالب میں دوسرا انٹر یونیورسٹی تقریری مقابلہ منعقد ہوا جس کا موضوع تھا " ہندوستان میں اردو کا مستقبل روشن ہے "۔

جلسہ کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری جناب محمد شفیع قریشی نے فرمائی اور ڈاکٹر سروپ سنگھ سابق وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے اس کا افتتاح کیا۔ سب سے پہلے غالب انسٹی ٹیوٹ کے قائم مقام ڈائرکٹر جناب رفعت سروش نے معزز مہمانوں کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ نے اپنی تقریر میں اردو کی تعلیم کے مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اگر ہر یونیورسٹی میں شعبۂ اردو ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ میں عزت کی زندگی چاہتا ہوں اور یہ زندگی اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک مل کر نہ رہیں، جب تک ہر ایک کو اپنا سمجھ کر نہیں چلیں گے اس وقت تک ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ جب صحت مند

سیاست آئے گی تب ہی ملک چل سکتا ہے اور اُردو کا مستقبل روشن ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد صدر جلسہ جناب محمد شفیع قریشی صاحب نے فرمایا کہ ڈاکٹر سروپ سنگھ کو افتتاح کے لیے اس لیے مدعو کیا گیا تھا کہ ان کی حق گوئی، بیباکی اور صفائی سے بات کہنا ان کی شخصیت کا ایک حصہ ہے۔ یہ احساس نئی نسل میں پیدا ہو گیا ہے کہ ہمیں اپنی زبان اور تہذیب کو بچانا ہے۔ اپنے ملک میں اپنی زبان اور تہذیب کو بچانا ان کا آئینی حق ہے۔

اس تقریری مقابلے کے لیے جناب رشید حسن خاں اور پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے ججوں کے فرائض انجام دیئے۔

اس کل ہند انٹر یونیورسٹی تقریری مقابلے میں غالب رننگ ٹرافی حاصل کرنے کا اعزاز یونیورسٹی آف حیدرآباد کو ہے۔ اور مس صائقہ مرزا کشمیر یونیورسٹی۔ سری نگر، جناب غلام رازق خلیل الرحمٰن (گجرات یونیورسٹی احمد آباد) اور نوید احمد (بنگلور یونیورسٹی) کو بالترتیب پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام دیا گیا۔ ایک خصوصی انعام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طالبہ پرتیبھا شرما کو دیا گیا اور اس طرح یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

فخرالدین علی احمد میموریل لکچر

غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ۱۶ اپریل ۸۵ء کو فخرالدین علی احمد میموریل لیکچر کا اہتمام کیا گیا جس میں اردو کے نامور ادیب پروفیسر آل احمد سرور نے اپنا مقالہ پڑھا۔ عنوان تھا ''اردو اور ہندوستانی تہذیب''۔

اس مقالے کے آغاز سے پہلے غالب انسٹی ٹیوٹ کے قائم مقام ڈائرکٹر جناب نعمت سرور نے صدر جلسہ، مقالہ نگار اور سامعین کو خوش آمدید کہتے ہوئے غالب انسٹی کی مختلف ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور صدر جلسہ جناب آنند نرائن ملا، سیمینار کمیٹی کے چیرمین پروفیسر نذیر احمد نے ڈاکٹر سروپ سنگھ اور مقالہ نگار کا استقبال کیا۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اردو اور ہندوستانی تہذیب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی تہذیب پر بیرونی اثرات ہمیشہ پڑے ہیں۔ اردو زبان پر عربی کے اثرات کم اور فارسی

کے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا جدید اردو زبان کھڑی بولی پر مشتمل ہے۔ اردو کے قدیم نسخے صوفیائے کرام کی تحریروں میں ملتے ہیں انھوں نے کہا کہ فورٹ ولیم کالج کے وجود میں آنے سے پہلے اردو زبان وجود میں آچکی تھی اور آزادی کے بعد کثرت سے ہندی الفاظ اردو میں آگئے۔

سرور صاحب نے اردو کے مشہور شاعر نظیر اکبرآبادی کو ہندوستانی تہذیب کا عاشق قرار دیا انھوں نے کہا کہ نظیر اکبرآبادی نے آدمی نامہ لکھا جو انسان دوستی کی ایک دستاویز ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اردو کی مقبول ترین صنف غزل اور اس کی مقبولیت پر روشنی ڈالتے ہوئے چند منتخب اشعار سنائے۔ مثلاً:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

عورتوں کی زبان کی نشاندہی کرتے ہوئے انھوں نے چند اشعار سنائے:

اب تو میں اوڑھنے کی نہیں کل کی اوڑھنی
باجی مجھے منگا دو جھلا جھل کی اوڑھنی

جناب آل احمد سرور نے کہا کہ اردو کے رسم الخط کو بدلنے کے معنی ہیں اردو زبان و ادب کے سارے سرمایہ سے بیگانگی انھوں نے مزید کہا کہ ہماری سطحی سیاست نے اردو زبان کو نقصان پہنچایا ہے جبکہ ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے سیاست داں اس زبان پر فخر کرنا سیکھیں اور اس کو مناسب حیثیت دیں۔ صرف سائنس کی ترقی پر ملک کی ترقی کا دارومدار نہیں بلکہ ادب و تہذیب کی بھی ترقی ہونی چاہیئے۔

مقالے کے اختتام پر صدر جلسہ جناب آنند نرائن ملا نے کہا کہ آج کا موضوع میرے نزدیک دو ٹکڑوں میں ہے "اردو اور ہندوستانی تہذیب" اس میں ایک ٹکڑا زائد ہے میرے نظریہ

کے مطابق اُردو اور ہندوستانی تہذیب ایک ہی چیز ہے ۔ ہندوستانی تہذیب کے لیے اُردو ویسی ہی ضروری ہے جیسی کسی اور چیز کے لیے زندگی کی ضرورت ہے آج اُردو زبان کے تحفظ کا خیال پہلے کرنا چاہیے اور اُردو ادب کے تحفظ کا خیال بعد میں اگر زبان کا تحفظ نہ ہوا تو ادب کا تحفظ کیا ہوگا ۔ وہی زبان زندہ رہتی ہے اور آگے بڑھتی ہے جس کا عوام سے رشتہ ہے ۔ اگر عوام سے رشتہ مضبوط نہیں تو وہ زبان سسک سسک کر دم توڑ دے گی ۔

میکش اکبر آبادی کو استقبالیہ

آگرہ ۲۹ اپریل شام پانچ بجے غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے منعقدہ ایک سادہ مگر پروقار تقریب میں اردو و فارسی کے مشہور دانشور، نقاد اور شاعر جناب میکش اکبر آبادی کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں جناب میکش اکبر آبادی کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے لیے سپاس نامہ اور چاندی کی ایک طشتری پیش کی گئی۔ جلسے کی صدارت آگرہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب اے۔ پی ماتھر نے فرمائی۔ جلسے میں آگرہ شہر کے دانشور، شاعر، ادیب اور اعلیٰ درس گاہوں کے اساتذہ اور طالب علموں کے علاوہ علی گڑھ اور دہلی سے آئے معزز مہمان بھی شامل تھے۔ علی گڑھ سے پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر معز علی بیگ دہلی سے خواجہ حسن ثانی نظامی، جناب رشید حسن خاں، جناب رفعت سروش اور شاہد ماہلی کے علاوہ جے پور اور جھانسی جیسے شہروں سے بھی جناب ڈاکٹر فضل امام اور جناب ایاز جھانسوی وغیرہ نے جلسے میں شرکت فرمائی ۔

اُردو کے مشہور محقق و ادیب جناب رشید حسن خاں نے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے لیے اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے لیے یہ فخر اور عزت کی بات ہے کہ اردو کے ایک ایسے دانشور اور عالم کو خراج عقیدت پیش کرنے ہم حاضر ہوئے ہیں جس کی کتابیں پڑھ کر ہم نے زبان سیکھی ہے، ادب اور تحقیق سے دلچسپی پیدا ہوئی ہے ۔ آج جب کہ اقبال پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے مگر ۱۹۴۹ء میں جناب میکش اکبر آبادی نے نقد اقبال جیسی اہم کتاب لکھ کر

اقبال شناسی کو ایک نیا رُخ دیا تھا تب سے آج تک یہ کتاب اقبال کے سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ میکش صاحب کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب رشید حسن خاں نے فرمایا میکش صاحب کلاسکی انداز کے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے غزل کو ایک نیا مزاج دیا ہے۔

پروفیسر نذیر احمد نے میکش اکبرآبادی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک مقالہ پیش کیا جس میں آگرہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میکش صاحب اکبرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کی آخری یادگار ہیں۔ میکش صاحب کے ادبی و علمی کارناموں پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے نذیر صاحب نے تصوف پر ان کے علم اور فن کمال پر روشنی ڈالی۔ اردو زبان کے بڑے بڑے نقاد ان کی علمی حیثیت تک نہیں پہنچ سکتے۔ آخر میں نذیر صاحب نے اس تقریب کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے ہر سال کسی نہ کسی عالم کی پذیرائی کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس سلسلے میں گذشتہ سال پٹنہ میں قاضی عبدالودود صاحب کے اعزاز میں ایک جلسہ کیا گیا تھا۔ اس سال ہم نے میکش صاحب کو منتخب کیا ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے خواجہ حسن ثانی نظامی نے میکش اکبرآبادی کی علمی و ادبی مرتبہ پر اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ "آپ کی علمی خدمات کا جائزہ اور ادبی تخلیقات کا شمار آسان نہیں ہے۔ مولانا حامد حسن قادری۔ نیاز فتح پوری۔ نواب جعفر علی خاں۔ اثر لکھنوی۔ پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر محمد حسن جیسے اہلِ نظر آپ کے مداح ہیں۔ نثر کی کتابوں میں آپ کی تصنیفات نغمہ اور اسلام، غوث الاعظم، مسائل تصوف، شرک اور توحید اور نقد اقبال یادگار حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ کے متفرق مضامین برصغیر کے بہت سے علمی ادبی مجلوں کی شان بڑھا چکے ہیں۔ خسرو شناسی کے سلسلے میں آپ کے ایک مضمون کا ترجمہ روسی زبان میں بھی کیا گیا ہے۔ آپ کے شعری مجموعے، میکدہ، حرف تمنا اور داستان شب ارباب ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ داستان شب کو اردو اکیڈمی لکھنؤ نے انعام دیا۔ میر اکیڈمی لکھنؤ اور حکومت ہند نے بھی انعامات کے ذریعہ آپ کے کمالات کا اعتراف کیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، انشا اللہ آپ کی خدمت میں مودی غالب ایوارڈ برائے اردو شاعری گذرانے گا۔ اس وقت ہم عقیدت کے چند پھول لے کر سپاس گذاری کے لیے حاضر ہوئے ہیں،

انہیں قبول فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ علم و ادب اور اردو زبان پر تادیر قائم رکھے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ تصوف کے علم و فلسفے کو میکش صاحب نے جس قدر گہرائی سے سمجھا ہے اور تحریر کیا ہے دوسرا شاید ہی کوئی شخص ہو۔ نقد اقبال جیسی نایاب کتاب پھر سے لکھی جانا ممکن نہیں ہے۔ اگر یہ کتاب انگریزی اور ہندی میں شائع ہو سکے تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

آخر میں صدر جلسہ جناب اے۔ پی۔ ماتھر وائس چانسلر آگرہ یونیورسٹی نے جناب میکش اکبرآبادی کو غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ایک چاندی کی طشتری پیش کی اور میکش صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ میکش صاحب ہمارے شہر آگرہ کی شان نہیں بلکہ یہاں کی ملی جلی تہذیب کی آخری کڑی ہیں۔ ملک میں اس ملی جلی تہذیب کی آج بیحد ضرورت ہے۔ پرانی قدریں مٹ رہی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ان قدروں کو زندہ رکھیں اور علم و عمل میں یکسانیت پیدا ہو سکے۔ آخر میں ماتھر صاحب نے اعلان کیا کہ ان کی یہ کوشش ہوگی کہ یونیورسٹی کی جانب سے میکش صاحب کا تمام کلام شائع کیا جائے۔ زبان و تہذیب سے متعلق ایک میکش چیئر بھی قائم کی جائے۔ اور سینٹ جانس کالج میں ایم۔ اے۔ اردو کی تعلیم پھر سے شروع کی جائے۔

آخر میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے قائم مقام ڈائرکٹر جناب رفعت سروش نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میکش صاحب کا بطور خاص شکریہ کیا کہ انھوں نے یہ موقع دیا کہ ہم ان کے اعزاز میں جلسہ کر سکے۔ تمام مقررین خاص کر باہر سے آنے والے حضرات اور صدر جلسہ جناب ماتھر صاحب کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا۔

غالب کا ایک شعر

۲۸ جنوری کو شام کے چھ بجے غالب انسٹی ٹیوٹ میں ایک ادبی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت ماہر غالبیات جناب مالک رام صاحب نے فرمائی۔

سب سے پہلے سابق شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب مرحوم کے بارے میں پروفیسر انور صدیقی نے ایک مختصر مگر جامع تاثراتی مقالہ پڑھا جس میں مجیب صاحب کی جملہ خوبیوں کا احاطہ نہایت عمدگی سے کیا گیا تھا۔ اس کے بعد جناب شاہد ماہلی نے تعزیتی قرارداد پیش کی اور اہل جلسہ نے دو منٹ

خاموش کھڑے رہ کر مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔
اس کے بعد آج کے مقالہ نگار ڈاکٹر عبید الرحمن ہاشمی کو مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

ڈاکٹر ہاشمی نے غالب کے اس شعر کا تجزیہ نہایت خوبصورتی سے پیش کیا۔ انھوں نے اس شعر کے محاسن پر تفصیلی گفتگو کی اور "تصور" اور "گلشن" کو اس شعر کے کلیدی الفاظ قرار دیا۔ آخر میں انھوں نے کہا :

زیر بحث شعر جو کم و بیش ڈیڑھ سو سال قبل کی یادگار ہے آج بھی اتنا جدید اور مضمون اس قدر موثر ہے کہ وہ نہ صرف غالب کے ممتاز اور منفرد نمائندہ اشعار کی فہرست میں جگہ پانے کے قابل ہے بلکہ ہمارے پورے شعری سرمائے میں ایک خاص قدر و قیمت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر عبید الرحمن ہاشمی کا یہ مقالہ بھی طور پر پسند کیا گیا۔ صاحب صدر جناب مالک رام نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اشعار کے تجزیہ میں لفظوں کی طرف بھی دیکھنا چاہیے۔ سارا شعر ایک لفظ کے ارد گرد گھومتا ہے اور وہ لفظ ہے "تصور" جو اس شعر کی کنجی ہے۔ تصور گلشن نا آفریدہ کا ــــ یعنی ایک ایسا عہد آئے گا جس میں لوگ مجھ کو سمجھ سکیں گے۔ اس شعر میں تعلّی ہے۔ بحث میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی، پروفیسر عنوان چشتی، جناب انور صدیقی نے حصہ لیا۔
غالب کے شعر پر بحث کے بعد اسی زمین میں چند شعرا نے غزلیں پیش کیں۔

"تیسرا جہاں"

غالب انسٹی ٹیوٹ کے ہم سب ڈرامہ گروپ کی جانب سے ایک موسیقی سے لبریز ڈرامہ "تیسرا جہاں" غالب آڈیٹوریم میں ۲، ۳ اپریل ۱۹۹۵ء کو منعقد کیا گیا۔ جسے اردو کے مشہور شاعر جناب شہاب جعفری نے تحریر فرمایا تھا اور جناب عرفان عسکری نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ یہ ڈرامہ جو میر حسن کی مشہور زمانہ مثنوی سحر البیان پر مبنی ہے اور مصنف نے دورِ جدید سے ہم آہنگ کیا ہے۔ کافی پسند کیا گیا۔

اُردو کی کہانی روشنی اور آواز کی زبانی

یوں تو اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے اور بھی کئی میڈیم ہیں لیکن روشنی اور آواز کا وسیلہ ایک نیا تجربہ ہے۔

اُردو زبان کی تاریخ اور ارتقاء کو ڈاکٹر محمد حسن نے تیار کیا۔ عرفان عسکری نے ہدایت انجام دی۔

اس ٹیکنیک میں فلم، ریڈیو، اسٹیج سب کچھ شامل ہے۔ اس ڈرامے میں خود اردو کی زبان سے بیان کی ہوئی کہانی پیش کی گئی ہے جو ملک کے تہذیب و تمدن کی داستان ہے۔ ہندوستان کے تیج تہوار، بازار، دربار، خانقاہ، لباس، خورد و نوش، مجلسی زندگی، مختلف قوموں کے میل جول، سیاسی زندگی، آزادی کی تحریک، انقلاب کا نعرہ، عید، دیوالی، ہولی، محرم کے تعزئے اور مجالس عزا، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں یہ زبان رچی بسی ہوئی ہے۔ جس کی جھلکیاں اس حیرت انگیز ڈرامے میں پیش کی گئی ہیں۔

یہ ڈراما ہندوستان کے مشہور ادارہ غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی کے "ہم سب ڈراما گروپ" کی جانب سے بیگم عابدہ احمد کی سرپرستی میں تیار ہوا اور جب یہ پہلی بار اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی جانب سے لکھنؤ میں پیش کیا گیا تو دھوم مچ گئی۔ لکھنؤ کے بعد یہ دہلی اور پٹنہ میں بھی دکھایا گیا ہے اور اب اُردو اکادمی دہلی نے پیش کیا ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کی نئی مجلسِ عاملہ کی تشکیل

غالب انسٹی ٹیوٹ کے متولیوں کا ایک جلسہ ۲۱ فروری ۸۵ء کو ایوانِ غالب، نئی دہلی میں منعقد ہوا جس میں نئی مجلس عاملہ اور نئی سب کمیٹیوں کی حسب ذیل تشکیل عمل میں آئی:

۱۔ بیگم عابدہ احمد۔ ایم۔ پی	چیرمین
۲۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	وائس چیرمین
۳۔ جناب محمد شفیع قریشی	سکریٹری

۴۔ پروفیسر نذیر احمد — رکن مجلس عاملہ
۵۔ پروفیسر سید امیر حسن عابدی — " " "
۶۔ جناب محبوب احمد — " " "
۷۔ خواجہ حسن ثانی نظامی — " " "
۸۔ جناب مہیشور دیال — " " "

لائبریری سب کمیٹی

۱۔ پروفیسر سید امیر حسن عابدی (چیرمین)
۲۔ جناب شہاب الدین انصاری
۳۔ پروفیسر نذیر احمد
۴۔ بیگم حمیدہ سلطان
۵۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی
۶۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد

پبلی کیشنز سب کمیٹی

۱۔ جناب رشید حسن خاں (چیرمین)
۲۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی
۳۔ پروفیسر ظ۔ انصاری
۴۔ جناب مہیشور دیال
۵۔ ڈاکٹر شارب ردولوی

سمینار و ادبی تقریبات سب کمیٹی

۱۔ پروفیسر نذیر احمد (چیرمین)

۲۔ پروفیسر سید امیر حسن عابدی
۳۔ ڈاکٹر خلیق انجم
۴۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ
۵۔ خواجہ حسن ثانی نظامی
۶۔ ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی
۷۔ ڈاکٹر کامل قریشی
۸۔ پروفیسر عبدالودود اظہر
۹۔ پروفیسر قمر رئیس

غالب نامہ ایڈیٹوریل بورڈ

۱۔ پروفیسر نذیر احمد (چیرمین)
۲۔ جناب رشید حسن خاں
۳۔ ڈاکٹر نورالحسن انصاری
۴۔ جناب شاہد ماہلی

بلڈنگ سب کمیٹی

۱۔ جناب محمد شفیع قریشی (چیرمین)
۲۔ جناب مہیشور دیال
۳۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء کے لیے غالب انعامات کا اعلان

۲۱ فروری کو غالب انسٹی ٹیوٹ کی ایوارڈ سب کمیٹی کا جلسہ ایوان غالب، نئی دہلی میں منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل دانشوروں کو انعامات دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

۱۔ فخرالدین علی احمد غالب انعام	۱) پروفیسر مختارالدین احمد (برائے ۸۳ء)
(برائے اُردو فارسی تحقیق)	۲) پروفیسر ابو محمد سحر (برائے ۸۴ء)
۲۔ مودی غالب انعام	۱) جناب خواجہ احمد عباس (برائے ۸۳ء)
(برائے اُردو نثر)	۲) جناب صباح الدین عبدالرحمن (برائے ۸۴ء)
۳۔ مودی غالب انعام	۱) نازش پرتاپ گڑھی بیں مرگ (برائے ۸۳ء)
(برائے اُردو شاعری)	۲) جناب میکش اکبر آبادی (برائے ۸۴ء)
۴۔ ہم سب غالب انعام	۱) محترمہ شیلا بھاٹیہ (برائے ۸۳ء)
(برائے اُردو ڈرامہ)	۲) جناب اظہر افسر (برائے ۸۴ء)
۵۔ سلوانیا لکشمن غالب انعام	۱) جناب یونس دہلوی (برائے ۸۳ء)
(برائے اُردو صحافت)	۲) جناب ناز انصاری (برائے ۸۴ء)
۶۔ ساگر سوری غالب انعام	۱) جناب فکر تونسوی (برائے ۸۳ء)
(برائے اردو طنز و مزاح)	۲) جناب یوسف ناظم (برائے ۸۴ء)
۷۔ پدم چند غالب انعام	۱) جناب فضل الرحمٰن (برائے ۸۳ء)
(برائے خطاطی)	۲) جناب سید مختار الزماں (برائے ۸۴ء)

اول چار انعامات دس دس ہزار روپیہ نقد اور باقی تین انعامات پانچ پانچ ہزار روپیہ نقد اور ایک ایک تمغہ اور توصیفی اسناد پر مشتمل ہیں۔

تقسیم انعامات کی تقریب جلد ہی عمل میں آئے گی۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کی تازہ ترین پیش کش

نقد قاطع برہان

معہ ضمائم

پروفیسر نذیر احمد

قیمت : ساٹھ روپے

ملنے کا پتا

غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

غالب انسٹی ٹیوٹ کی مطبوعات

غالب کے خطوط

مرتبہ ——— ڈاکٹر خلیق انجم

صفحات ۴۸۲ قیمت ۷۵ روپے

مشہور و ممتاز محقق ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے اردو خطوط کا چار جلدوں میں تنقیدی اڈیشن تیار کیا ہے۔ پہلی جلد شائع ہو چکی ہے۔ باقی تین جلدیں زیر طبع ہیں۔

مثنویاتِ غالب

مع اردو ترجمہ

ترتیب و ترجمہ ——— ڈاکٹر ظ۔ انصاری

خوب صورت گٹ اپ اور آفسٹ کی عمدہ طباعت

قیمت ۶۰ روپے

مقالاتِ بین الاقوامی غالب سیمینار

(انگریزی) ۱۹۶۹ء

مرتبہ ——— ڈاکٹر یوسف حسین خاں

بین الاقوامی غالب سیمینار میں پڑھے گئے انگریزی مقالات کا مجموعہ۔

صفحات: ۱۴۶ قیمت ۱۰ روپے

دیوانِ غالب

مرتبہ ——— مالک رام

دیوانِ غالب کا یہ نسخہ مطبع نظامی کانپور کے نسخے پر مبنی ہے جو ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ غالب کا صحیح کردہ متن ہے اور اس میں کلام بھی سب سے زیادہ ہے۔

قیمت ۱۲/۵۰ روپے

مقالاتِ بین الاقوامی غالب سیمینار

(اردو) ۱۹۶۹ء

مرتبہ ——— ڈاکٹر یوسف حسین خاں

غالب کی صد سالہ یادگاری تقریبات کے سلسلے میں منعقد "بین الاقوامی غالب سیمینار" میں پڑھے گئے مقالوں کا مجموعہ۔

صفحات: ۳۵۶ قیمت ۲۰ روپے

دیوانِ غالب (ہندی)

مرتبہ ——— نورنبی عباسی

معنی و ضروری تشریح کے ساتھ

خوب صورت طباعت

قیمت ۳۰ روپے

غزلیاتِ غالب (فارسی)
(انگریزی)

مرتبہ ــــ ڈاکٹر یوسف حسین خاں

غالب کی فارسی غزلوں کا انگریزی ترجمہ۔ ترجمے میں انگریزی ترجمے کے ساتھ فارسی متن بھی شامل ہے۔ قیمت ۸۰ روپے

دستنبو اسداللہ خاں غالب

جس میں غالب نے اپنی سرگذشت ابتدا ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے۔
صفحات ۵۰ قیمت ۵۰/۴ روپے

غزلیاتِ غالب (اردو)
(انگریزی)

مرتبہ ــــ ڈاکٹر یوسف حسین خاں

غالب کی غزلوں کے انتخاب کے کئی انگریزی ترجمے شائع ہو چکے ہیں لیکن یہ ترجمہ ایک اسکالر کا ہے، جو غالب کا مزاج شناس ہے۔

ترجمے کے ساتھ اصل غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں۔
قیمت ۹۶ روپے

سیر المنازل

اوائل انیسویں صدی عیسوی کی دہلی کی مستند اور معتبر تاریخ
مرزا سنگین بیگ (فارسی متن مع اردو ترجمہ)
ترتیب و ترجمہ: ڈاکٹر شریف حسین قاسمی
قیمت ۴۵ روپے

قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ

مرتبہ ــــ قاضی عبدالودود

غالب کی فارسی اور اردو نثر کا بیش قیمت تحفہ۔ صفحات ۲۹۶

قیمت ۲۵ روپے

خاندانِ لوہارو کے شعرا

مرتبہ ــــ حمیدہ سلطان احمد

جس میں خاندانِ لوہارو کے شعرا کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام مع تنقید و تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔

قیمت ۳۰ روپے

غالب انسٹی ٹیوٹ کا ششماہی رسالہ

غالب نامہ

اردو ادب میں ادبی تحقیق اور تنقید کی رفتار کا آئینہ

مدیرِ اعلیٰ ــــ پروفیسر نذیر احمد
مدیران: رشید حسن خاں، نور الحسن انصاری، شاہد ماہلی
قیمت فی شمارہ: ــــ ۳۰ روپے
زرِ سالانہ: ــــ ۵۰ روپے

ملنے کا پتا: غالب انسٹی ٹیوٹ ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲